بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نوائے دل نواز

اس وقت، امریکہ، اسرائیل، اور بھارت کا جو محور (Axis) پاکستان کو بری طرح اپنے گھیرے میں لئے جا رہا ہے یہ صورت حالات بڑی تشویش انگیز ہے، اور ذمہ دار حضرات اس کے مداوا کے لئے مختلف تدابیر سوچ رہے ہوں گے لیکن جہاں تک ہم غور کر سکتے ہیں اس کا ایک ہی توڑ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں بلا مزید تاخیر وہ معاشی نظام رائج کر دیا جائے جسے قرآن ان مصائب و مشکلات کا واحد حل قرار دیتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال نے اپنے 28 مئی 1937ء کے خط میں قائداعظم کو لکھا تھا کہ:

> شریعت اسلامی کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو اس کی رو سے ہر فرد مملکت کو اس کے رزق کی ضمانت (مملکت کی طرف سے) مل جاتی ہے..... اسلام کے لئے معاشی جمہوریت (یعنی رزق کے سرچشموں کا عوام کے لئے عام ہو جانا).....کوئی انقلاب نہیں ہوگا بلکہ حقیقی اور خالص اسلام کی طرف مراجعت ہوگی۔

اور قائداعظم نے اپنی آخری تقریر میں (جو انہوں نے یکم جولائی 1948ء کو، اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر کی تھی) فرمایا تھا کہ:

> مغرب کے معاشی نظام نے نوع انسانی کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں.....اس نظام کی رو سے ہم اپنا نصب العین، یعنی عوام کی مرفہ الحالی اور اطمینان، کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمیں اپنا راستہ آپ تراشنا چاہئے اور دنیا کے سامنے وہ نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلام کے، نوع انسانی کی مساوات اور عدل عمرانی کے تصور پر مبنی ہو۔

یہ الفاظ کہ اسلام اپنا مخصوص معاشی نظام رکھتا ہے' ہم یہاں برسوں سے مختلف زبانوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن وہ نظام درحقیقت ہے کیا۔ اس کے متعلق آج تک کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ طلوع اسلام ایک عرصہ سے اس نظام کو پیش کرتا چلا آ رہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کی رو سے ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی اور اس کی ذات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اگر کوئی مملکت اس ذمہ داری کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتی یا اس فریضہ کی ادائیگی نہیں کرتی تو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ اسلامی مملکت وہی ہوسکتی ہے جس کے کاروبار میں صفات خداوندی منعکس ہو رہی ہوں اور ان صفات میں سب سے پہلی اور بنیادی صفت' رب العالمینی کی صفت ہے یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت۔ اس میں انسان کے جسم اور اس کی ذات دونوں کے تقاضوں کا پورا کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مملکت اس اہم فریضہ سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔

ہم اس حقیقت کو برسوں سے دہرائے جا رہے ہیں لیکن ارباب اقتدار اور مذہب پرست طبقہ دونوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ ارباب اقتدار کی طرف سے اس لئے کہ اس سے خود ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے اور مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس لئے کہ وہ اس مذہب کا علمبردار ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا (اور جو اس دین کی نقیض ہے جسے نبی اکرمؐ نے خدا سے لے کر دنیا کو دیا تھا) اور اس کے اپنے مفاد خود اس سرمایہ دار طبقہ سے وابستہ ہیں۔ لیکن ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر پہلے اس کی ضرورت شدید تھی تو اب اشد ہے کہ اس قرآنی نظام کو یہاں بلا مزید تاخیر جاری کر دیا جائے ورنہ' موجودہ نظام کے ماتحت یہاں عوام کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سیلاب بلا کے لئے خود دعوت بن جایا کرتی ہے امریکہ' اسرائیل اور ہندوستان کے مشؤم عزائم کا یہی ایک توڑ ہے۔

بہ ملازمانِ سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل نوازے

قرآنی نظام ربوبیت ہی وہ ''نوائے استوار'' ہے جس سے ہم دلوں کی تسخیر کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محترم وزیراعظم سے

ہم نے طلوع اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ حکومت کے مقصود و منتہٰی کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے تو

اس کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی لیکن اگر ان تفاصیل کو سمٹا کر مختصر کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حکومت سے مقصود یہ ہے کہ ملک کے باشندے اطمینان اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں پاکستان میں جتنی حکومتیں بھی قائم ہوئیں' سب اپنے مقصود میں ناکام رہی ہیں۔ ملک کے باشندوں کو نہ اطمینان نصیب ہوا نہ خوش حالی۔ بلکہ' اس کے برعکس' ان کی بے اطمینانی اور بدحالی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس افسوسناک صورتِ حالات کے وجوہ و اسباب متعدد ہیں لیکن اس کے بنیادی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ حکومت کے دفاتر کی مشینری اس ڈھب سے چل رہی ہے کہ جو بدنصیب اس کے چکر میں پھنس جاتا ہے' وہ اپنی قسمت کو روتا ہے۔ وہاں قاعدہ اور قانون (Role of the Law) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو تنگ اتنا کیا جاتا ہے کہ اچھے اچھے اصول پرست بھی ان کے تقاضوں کو پورا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاخیر کا یہ عالم ہے کہ اس نے پرانی دیسی ریاستوں کی مضحکہ انگیز کہانیوں کو مات کر دیا ہے۔ ان دفاتر کے ہاتھوں ایک دنیا چیخ رہی ہے' لیکن کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔ دفاتروں ہی کا ایک شعبہ عدالتوں کو سمجھئے۔ ان میں کسی کو انصاف کی توقع نہیں رہی۔ ہر طرف دھاندلی ہے اور رشوت۔ اس کا نتیجہ یہی نہیں کہ لوگ بے اطمینان اور بدحال ہو رہے ہیں بلکہ ان کے دل سے قانون کا احترام اور حکومت کا وقار اٹھ گیا ہے۔

آپ کے برسر اقتدار آنے سے یہ امید قائم ہوئی تھی کہ آپ اس مشینری کو ڈھب پر لے آئیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوسرے کاموں میں اس قدر مصروف ہیں کہ آپ کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جن کاموں میں آپ مصروف ہیں' ان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں' لیکن ایسا کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں ہوگا کہ اگر وہ سب کام ٹھکانے بھی لگ جائیں لیکن دفاتری اور عدالتی نظم و نسق بد سے بدتر ہوتا جائے تو ایسی حکومت کبھی کامیاب حکومت نہیں کہلا سکے گی۔ ہماری آپ سے باادب گزارش ہے کہ آپ دیگر امور حکومت کو اس طرح بانٹ دیجئے کہ آپ کو اس اہم شعبہ کی دیکھ بھال کے لئے کافی وقت مل سکے۔ اگر آپ کے زمانۂ حکومت میں دفتری اور عدالتی مشینری صحیح خطوط پر چل پڑی تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے استحکام پاکستان اور فلاح و بہبود عوام کے لئے ایک نمایاں خدمت سرانجام دے دی۔ آپ کے حسنِ تدبر کا یہی ٹیسٹ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

طلوعِ اِسلام کا مقصد و منتہٰی

حق کی مخالفت کرنے والوں کے پاس' حق کی تردید اور اپنے باطل دعویٰ کی تائید کے لئے دلائل و براہین تو ہوتے نہیں۔ اس لئے وہ اس کے خلاف بہتان طرازی اور افترٰی پردازی سے کام لیتے ہیں۔ یہی ان کے پاس سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے۔ یہی حربہ ہے جو طلوع اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لئے جو ان مخالفین کی طرف سے پیدا کی جاتی ہیں۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت کر دی جائے۔ آج جبکہ ماہنامہ طلوع اسلام کا نئے سال کا دوسرا پرچہ شائع ہو رہا ہے ہم اس مقصد کو ایک بار پھر دہراتے ہیں۔ حدیث وسنت کے بارے میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ:

(۱) قرآن کریم خدا کی طرف سے تمام نوع انسانی کے لئے آخری اور مکمل ضابطۂ دین ہے اس کی اتباع کے بغیر کامیابی اور سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔

(۲) قرآن کریم چونکہ تمام نوع انسانی کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ضابطۂ دین ہے اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دیئے گئے ہیں۔ اس سے منشائے خداوندی یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے' جزئی قوانین مختلف زمانوں کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یہ جزئیات اسلامی نظام شورائیہ متعین کرے گا۔

(۳) سب سے پہلے اس قسم کا نظام' نبی اکرمؐ نے متعین فرمایا۔ اور قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے' جزئی قوانین قرآن کے حکم کے مطابق اپنی بصیرت اور صحابہؓ کے مشورے سے مرتب فرمائے۔

(۴) رسولؐ اللہ کے بعد یہی سلسلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جاری رہا۔ اور انہوں نے جن جزئی قوانین کے متعلق دیکھا کہ ان میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا' جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ ان میں تبدیلی کر لی اور جہاں کوئی نیا تقاضا سامنے آیا۔ اس کے لئے نیا قانون وضع فرما لیا۔

(۵) خلافت راشدہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب جو اسلامی نظام علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ وہ وضع قوانین کے لئے رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدینؓ کا طریقہ اختیار کرے گا۔ یعنی وہ قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کی ضرورتوں کا جائزہ لے گا۔ اگر پہلے سے مرتب شدہ قوانین ان ضرورتوں کو کما حقہٗ پورا کریں گے تو وہ انہیں علیٰ

حالہ رہنے دے گا اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے گا تو وہ تبدیلی کر لے گا اور نئے تقاضوں کے لئے نئے قوانین مرتب کرے گا۔

(۶) جب تک یہ اسلامی نظام قائم نہ ہو' کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ امت جن جزئی قوانین پر کاربند ہے ان میں ردوبدل کر کے ملت میں مزید انتشار اور تفرقہ انگیزی کا موجب بنے (اس اصول کی روشنی میں ظاہر ہے کہ جو لوگ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ طلوع اسلام کہتا ہے کہ تین نمازیں پڑھو اور نو دن کے روزے رکھو وہ کذاب ہیں اور افترا پرداز)۔

(۷) رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ کے عہد مبارک کا ریکارڈ ہماری کتب روایات (و کتب سیر و تاریخ) میں منضبط ہے۔ ان میں کتب روایات (احادیث) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرما کر اپنی امت کو دیا۔ اور نہ ہی صحابہ کبارؓ نے مرتب فرمایا۔ یہ مجموعے حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد' انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئے۔ ان مجموعوں میں دو قسم کی احادیث ملتی ہیں' ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے۔ دوسری وہ جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے ہے۔ پہلی قسم کی روایات کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے۔ باقی رہیں دوسری قسم کی روایات' سو یہ حقیقت ہے کہ حضورؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان مجموعوں میں ایسی روایات بھی ملتی ہیں جو حضورؐ کی سیرت کو داغدار کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی تمام روایات غلط ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کے پرکھنے کا معیار خود قرآن ہے۔ جو روایات اس معیار پر صحیح اترتی ہیں' وہی حضورؐ کی سیرت کو صحیح شکل میں پیش کرتی ہیں۔ اس قسم کی روایات سے قرآن کے آئینے میں حضورؐ کی جو سیرت مرتب ہوگی وہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے نمونہ (اسوۂ حسنہ) پیش کرے گی کہ ایک پاکباز اور بلند کردار انسان کی زندگی ایسی ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

یہ ہے اس باب میں طلوع اسلام کا مقصد۔ جو شخص اس کے خلاف کوئی بات طلوع اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے' وہ جھوٹ بولتا اور بہتان تراشی کرتا ہے۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ جسے طلوع اسلام کی مخالفت کرنی ہے وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر مخالفت کرے' اور جسے اس کا ساتھ دینا ہے۔ وہ بھی اس مقصد کو سمجھ کر اس کا ساتھ دے۔

والسلام علیٰ من تبع الھدیٰ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

س ج د

السجود کے معنی ہیں' سر کو جھکا دینا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنیٰ' پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں۔ نخلة ساجدة۔ جھکا ہوا کھجور کا درخت' بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے (تاج)۔ سجد البعیر۔ اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تا کہ سوار اس پر بیٹھ جائے (تاج)۔ لہٰذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دور حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہئے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے' اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے' اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے ''سر جھکا دیا'' تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے حکومت کے قانون سے ''سرکشی'' اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ' اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے وللہ یسجد ما فی السمٰوٰت وما فی الارض من دابة والملٰئکة وھم لا یستکبرون (۱۶/۴۹) ''اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ' سب خدا کے سامنے سربسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے''۔

یہاں یسجد کا مفہوم لا یستکبرون نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا کہ ویفعلون ما یؤمرون (۱۶/۵۰) ''انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں''۔ اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ج۔د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پذیری کے) معنوں میں۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) ''حواس'' کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصول علم یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اس زمانے کا مذہب (مذہب اور دین کے فرق کے لئے (ذ۔ھ۔ب) اور (د۔ی۔ن) کے عنوانات دیکھئے)۔ محسوسات کے دائرے میں گھرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لئے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے' نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ہاتھ' پاؤں' سر' آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اسی طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے)۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود' بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسولؐ اللہ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے۔ فاذا سجدوا (۴/۱۰۲)۔ ''پھر جب وہ سجدہ کر چکیں'' تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ''سجدہ'' سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے' اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں' نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین میں رائج

تھی۔ قرآن کریم میں' صلوٰۃ اور حج ہی وہ ''تقاریب'' ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے' حرکات وسکنات کرے تو اس سے جس قدر انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلوٰۃ کے عنوان (باب ص۔ل۔و) میں ملے گی۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا' اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہو گا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس پر خلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولٰکن البر..... (۲/۱۷۷)۔ ''نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو خدا' آخرت' ملائکہ' کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود' قرابتداروں' یتیموں' مساکین' ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے.....''۔ یعنی صلوٰۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس' قرآن کریم کہتا ہے کہ فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون الذین ھم یراء ون و یمنعون الماعون (۱۰۷/۵۰۷)۔ ''ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہئے' (بند لگا کر) روک رکھتے ہیں''۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے۔

المسجد ۔ پیشانی کو کہتے ہیں جو زمین پر رکھی جاتی ہے اور المسجد اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے (تاج)۔ یہ اسم ظرف ہے جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت' دونوں ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنا دی (۱۸/۲۱)۔ یعنی وہ مجاہدین تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہو گیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ انام بن گیا۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۷/۷)۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (۹/۱۰۹)۔ اور اس کا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر

سے تعبیر کیا ہے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ کہہ کر پکارا ہے (۹/۱۰۷)۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱) اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ''اللہ کی مسجدوں'' کو آباد کریں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ان المسجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا (۷۲/۱۸) ''مسجدیں صرف اللہ کے لئے ہیں۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو''۔ فرقہ بندی شرک اس لئے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے، اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ کعبے کو جو مسجد الحرام کہا گیا ہے (۲۷/ ۴۸) تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ وہ اس امت کا مرکز محسوس ہے جس کی خصوصیت مسلمۃ لک (۲/۱۲۸) بتائی گئی ہے یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا اس لئے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی برکنا حولہ لنریہ من ایٰتنا (۱/۱۷) ''وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجد الحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیاں) دکھائیں''۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف سے جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لنریک من ایٰتنا الکبریٰ (۲۰/۲۲) ''تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں''۔ یہ آیات، آویزش حضرت موسیٰؑ و فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لئے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' اور عام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ب۔د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی

ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (۳۱/۷) اس میں ''مسجد'' (ظرف) کو مصدری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے (لسان العرب سے اس کی تائید ہوتی ہے۔) یعنی اطاعت کرنا۔ اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رہبانیت کو اطاعت وعبادت کا منتہٰی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترک دنیا۔ ترک لذت۔ ترک زیبائش وآرائش۔ قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش وآرائش' خدا کی اطاعت کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لئے اسے ترک کرنا' اطاعت نہیں۔ ان چیزوں سے ضروری متمتع ہونا چاہئے۔ صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ اس آیت کے اگلے حصے اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے۔ و کلوا و اشربوا ولا تسرفوا۔ ان اللہ لا یحب المسرفین (۳۱/۷)۔ ''تم کھاؤ پیو۔ لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' اس سے اگلی آیت میں ہے قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق..... (۳۲/۷)۔ ''ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے''؟ دو آیتیں پہلے ہے قل امر ربی بالقسط واقیموا وجوھکم عند کل مسجد و ادعو مخلصین لہ الدین ..... (۲۹/۷)

''ان سے کہہ دو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو۔ اور اطاعت کو خالص اسی کے لئے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو''۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے۔

سورۃ الفتح میں محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے متعلق ہے تراھم رکعا سجدا (۲۹/۴۸)۔ ''تو انہیں رکوع کرتے ہوئے۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھے گا''۔ یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلوٰۃ کے رکوع وسجود ہونگے اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو' ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سر تسلیم خم کئے ہونگے۔ اس کے بعد ہے سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (۲۹/۴۸)۔ اس کے عام معنی ہیں ''ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں''۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان وسکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات وجذبات کا اثر' اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے یعرف المجرمون بسیمٰھم (۵۵/۴۱) مجرم اپنی علامات سے پہچانے جائیں گے۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینائے رخ سے جھلک کر باہر آ جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویزؒ

حج کی اہمیت

ذیل میں ہم پرویز علیہ الرحمتہ کی وہ تقریر شائع کر رہے ہیں جو ۱۹۵۱ء میں حج کے موقع پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوئی۔
(ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ) طلوع اسلام۔

انسان کی ابتدائی زندگی پر غور کیجئے۔ زمین پر بڑے بڑے پُر آشوب دریا اور ان کی حدود فراموش طغیانیاں' مہیب جنگل اور ان میں بسنے والے خوفناک درندے' آسمان پر کڑکتی ہوئی بجلیاں اور گرجتے ہوئے بادل۔ اس ہیبت انگیز ماحول اور لرزہ انگیز حالات میں گھرا ہوا انسان' نہتا اور تنہا! انہی خطرات کے ہجوم نے اس کے جذبۂ معاشرت (Herd Instinct) کو بیدار کیا اور اس نے الگ الگ رہنے کے بجائے خاندانوں میں مل جل کر رہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ انسانی معاشرتی زندگی کی یہ پہلی شکل تھی۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو خاندانوں نے قبائل کی صورت اختیار کر لی۔ اس اجتماعی زندگی سے اس نے فطرت کی قوتوں کو رفتہ رفتہ مسخر کرنا شروع کر دیا لیکن خود انسانوں کے مشترکہ مفاد کے ٹکراؤ سے خاندانوں اور قبیلوں میں باہمی مخالفتیں شروع ہو گئیں اور اس طرح خارجی خطرات کی جگہ داخلی عداوت نے لے لی۔ یہی قبائل پھیل کر قومیں بن گئے۔ اس وقت تک دنیا قوموں میں بٹی چلی آ رہی ہے اور مختلف قوموں کی باہمی عداوت اور رقابت کا جو عالم ہے وہ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس اعتبار سے اس دور تہذیب و تمدن کا انسان بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے جہاں ابتدائی دور وحشت و بربریت کا انسان تھا۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ اس وقت اسے صرف ایک دوسرے پر پتھر پھینکنا آتا تھا اور آج یہ ترقی کرتے کرتے ایٹم بم پھینکنا بھی سیکھ گیا ہے۔ قومیت پرستی کی اس لعنت سے صرف یہی نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں امن و سکون باقی نہیں رہا۔ اس نے انسانیت کے بنیادی تصورات تک بدل دیئے ہیں ڈاکٹر ہکسلے کے الفاظ میں:

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور خدائے واحد کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی یہ حیثیت انسان کی کچھ قیمت نہیں سمجھتی' دوسری طرف یہ باہمی تفرقہ انگیزی کا موجب ہے' انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھہراتی ہے۔

اہل مغرب پر یہ حقیقت پہلی جنگ کے بعد ہی بے نقاب ہوگئی تھی کہ ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی بنیادی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے۔لیکن چونکہ انسانی عقل ابھی تک قومیتوں کے دائرے سے آگے بڑھ نہیں سکی اس لئے انہوں نے اس کا علاج جمعیت الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کی تشکیل میں سوچا' لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی جماعت جس بری طرح ناکام رہی واقعات اس پر شاہد ہیں' اسکے متعلق (Reves) اپنی کتاب Anatomy of Peace میں لکھتا ہے کہ:

> لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربہ کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام U.N.O رکھ دینے سے ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی۔ U.N.O کامیاب ہوتی ہے یا ناکام' اسکا فیصلہ وقت کر دے گا۔ یہ ہے انسانی معاشرہ کی وہ شکل جسے انسانی عقل آج تک تجویز کر سکی ہے۔لیکن انسانی عقل سے ماوراء ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔اب دیکھئے کہ وحی نے اس مسئلہ کا حل کیا بتایا ہے۔

آج سے قریب پندرہ سو سال پہلے کی دنیا کا تصور سامنے لائیے جب سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات اس قدر محدود تھے کہ ایک بستی کے رہنے والے دوسری بستی کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے۔اور یہ چیز کسی کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ مختلف قوموں کے افراد میں کوئی شے قدر مشترک بھی ہو سکتی ہے۔عین اس زمانہ میں وحی کی زبان نے یہ اعلان کیا کہ کان الناس امة واحدة۔یادرکھو تمام نوع انسان ایک برادری ہے اس لئے نسل اور وطن کی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم تمہاری خود ساختہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔خلقکم من نفس واحدة۔اللہ نے تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے۔اس کے بعد اسنے کہا کہ جب تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ان کے معاشرے کی بنیادیں بھی ایک ہی آئین پر استوار ہونی چاہئیں۔ یعنی دور حاضرہ کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ One Mankind and one world Govt. اس کے بعد ان سے کہا کہ اس حقیقت کے پیش نظر تمام دنیا کے انسانوں کے دو حصے ہو جائیں گے ایک وہ جو اس آئیڈیالوجی کو اپنا ضابطہ حیات بنالیں انہیں ماننے والوں کی جماعت یا امت مسلمہ کہا جائے گا۔ دوسرے وہ جو اس روش زندگی سے انکار کریں اور انسانوں کی قومی گروہ بندیوں کو قائم رکھتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں۔انہیں غیر مسلم کہا جائے گا۔امت مسلمہ کے سالانہ اجتماع کا نام حج ہے۔اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ تمام دنیا میں اس آئین کے مطابق حکومت ہونی چاہئے جو وحی نے مرتب کیا ہے' اپنے اپنے ملکوں سے نمائندے چنیں' یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی قیادت میں مرکز

وحدت انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔عرفات کے میدان میں ان کا باہمی تعارف ہو پھر یہ سب نمائندگان ملت اپنے میں سے ایک صدر کا انتخاب کریں اور تمام دنیا کے حالات کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کریں جسے آئندہ سال کے لئے بطور مشترکہ اصول اختیار کیا جائے۔ ان کا منتخب کردہ صدر اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ جائے۔اس کے بعد یہ تمام نمائندگان اس پروگرام کی جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ مختلف ممالک پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔ان مذاکرات کے بعد یہ نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو واپس آ جائیں اور اس طے شدہ پروگرام کی روشنی میں اپنے اپنے ہاں کا نظم ونسق چلائیں۔یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام دنیا کے انسانوں کو ایک امت بنانے اور ان کے معاشرتی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بنایا ہے۔قرآن نے حج کے اس مقصد کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے آپ ان مختصر الفاظ پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند اور کوئی انداز بیان اس سے بلیغ ہوسکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کا اجتماع ایسا ہے جس کے فائدے ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔لیشھدوا منافع لھم اور اس کی غرض وغائت کیا ہے؟ قیاما للناس ۔یعنی اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ انسانیت اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے۔غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمان، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام اور انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ ہو۔کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسان کے قیام کا موجب۔یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قیاما للناس ۔

آج دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر اس نقطہ تک تو آ پہنچی ہے کہ دنیا سے قومیتوں کی تفریق کو مٹا کر اس کی جگہ ایک عالمگیر برادری کا قیام نہایت ضروری ہے۔چنانچہ ڈاکٹر Gauld اپنی کتاب Man, Nature and Time میں لکھتا ہے کہ:

> اب یہ چیز بالکل فطری نظر آتی ہے کہ تمام نوع انسانی کی ایک منظّم برادری قائم کر دی جائے۔

اور ساری دنیا میں ایک حکومت کا خیال بھی روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔چنانچہ H.G.Wells نے 1942ء میں سائنس کانفرنس میں کہا تھا کہ:

> بُعدِ مکانی جو دنیا کی الگ الگ حکومتوں کے لئے وجۂ جواز تھا اب ختم ہو چکا ہے اب ان حکومتوں کی حدود ایک دوسرے پر بچھ چکی ہیں۔تمام نوع انسانی اب ایک ملت بن چکی ہے۔1900ء میں یہ ناممکن تھا کہ تمام دنیا کے معاملات کو ایک نظام امن کی شکل میں منضبط کیا جا سکتا۔اُس وقت ایک حکومت صرف ایک خاص رقبے میں ہی نظم ونسق قائم رکھ سکتی تھی، عالمگیر نظام قائم نہیں کر سکتی تھی۔اب بُعدِ مکانی کے ناپید ہو جانے سے ایک عالمگیر نظام نہ صرف ممکن العمل ہو چکا ہے بلکہ موجودہ جنگ اور اس کے بعد کے لوازمات کے پیش نظر اسکی ضرورت بھی اشد ہو چکی ہے۔

یعنی تمام دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہو رہا ہے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس خیال کو

عمل میں کس طرح لایا جائے! اس کا حل بھی وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے لئے اصولی طور پر آئین بھی ایک ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا آئین وہی ہوسکتا ہے جو مختلف اقوام کی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کے بجائے تمام نوع انسانی کی مشترکہ نشوونما کے اصول پر قائم ہو۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نظام ربوبیت ہے' جس دن دنیا کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اسی دن ایک عالمگیر حکومت کا خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔ حج کا اجتماع اسی نظام کی طرف دعوت کا پیغام ہے۔

یہ ہے حج کا قرآنی مفہوم۔ آج عالم اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ غیر مسلم قومیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک کے مسلمان مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں کہ انسانی لعنتوں کا متحدہ طور پر مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جارہی ہیں یہ سب کچھ ہورہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی کہ جو طریق ربط ونظم ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا اسے ہم ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر کہیں ہمارے اس اجتماع میں صحیح زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی تو اِس وقت عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہورہا ہے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلوں پر لگی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقام ہی یہی تجویز کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ وکذالک جعلنکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس۔ ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی مرکزی امت بنایا ہے اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر۔ تمام نوع انسانی کو حق وانصاف کے راستہ پر چلاؤ' اور انہیں ظلم وسرکشی کی راہوں سے روکو۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کو اس قسم کی پوزیشن اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب اس کے پاس اتنی قوت ہو کہ وہ اپنے فیصلوں کو تمام اقوام عالم سے منوا سکے' اس قسم کی قوت مرکزیت کے بغیر ناممکن ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہے جغرافیائی حیثیت سے دیکھئے تو انہیں ایک ایسی مرکزی پوزیشن حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور قوم کو میسر نہیں۔ انڈونیشیاء سے لے کر مراکش تک ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو مسلسل یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسباب اتحاد و یگانگت کو دیکھئے تو ان سب کا سرچشمۂ فکر اور محرک عمل ایک ہے۔ لیکن حالات کی ایسی قابل رشک سازگاری کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ اقوام عالم کی امامت و قیادت تو ایک طرف' ان کی ہمسری اور برابری بھی نصیب نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری مرکزیت گم ہوچکی ہے اگر یہ مرکزیت زندہ ہوجائے تو ہماری بے پناہ قوتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ مرکزیت کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی دوبارہ زندگی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارا حج کا اجتماع قرآنی خطوط پر متشکل ہوجائے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ پرویزؒ

ظفر احسن محمود

پیمانِ وفا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اے ہم سفرو! یہ کیا ہوا۔ کس بدخواہ کی نظر لگ گئی۔ ہم پہ وہ گزر گئی جو لکھ نہیں سکتے۔ وہ بیتی جو کہہ نہیں سکتے۔ وہ ہوا جو سوچ نہیں سکتے۔

وہ جو بحرِ الفت تھا نہ رہا۔ وہ جو سایۂ شفقت تھا ڈھل گیا۔ وہ جو دریائے مروت تھا خشک ہوا۔ وہ جو امیدوں کا شاہزادہ تھا چل دیا۔

غمِ زیست کے دکھیارو! مشفقِ مسیحانفس چلا گیا۔ اب زخمِ دل پر محبت کی مرہم کون رکھے گا۔ اب کس کا روئے متبسم تمہاری نا اُمیدی کو آس میں بدلے گا۔ اب دکھوں میں سہارا کون دے گا۔ کون دل شکستگی میں ہمیں گلے لگائے گا اور کس کی شگفتگیٔ مزاج کلبۂ افلاس کو منور کرے گی۔

اے حلقۂ یاراں! رزمِ حق و باطل میں اب پُشتیبان کون بنے گا۔ اب طلوعِ فجر کی اذان کون دے گا۔ اندھیرے کس طرح چھٹیں گے۔ اب آخری فتح و نصرت کی بشارتیں کون دیا کرے گا۔

جہانِ شوق تھا اُجڑ گیا۔ بزمِ آرزو تمام ہوئی۔ فسانۂ مہر و کرم ختم ہوا۔

مگر نہیں۔ اے دلِ الم نصیب ٹھہر۔ سُن یہ کیا آواز آ رہی ہے۔ ہوش کے کانوں سے صدائے دوست سن۔ فرمایا:

''بے شک میں اب چراغِ سحری ہوں لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فطرت کا قانون ہے کہ ہر سحر کے بعد صبح کی نمود ہوتی ہے۔ اس لیے میرے بجھنے کے بعد تاریکی نہیں، اجالا ہوگا۔'' (پرویزؒ)

اللہ اکبر۔ انسانیت کے روشن مستقبل پر اس قدر سچا اعتماد اور ایسا محکم یقین صرف پرویزؔ صاحب کے ہاں ہی مل سکتا ہے۔

امیدوں کی یہ نور بھری قوس قزح صرف وہی دل بُن سکتا ہے جو محبت سے لبریز ہو۔

یہ صدا کیسی انسان آفریں۔ انسان پرور اور انسان دوست ہے۔ اسے سُن کر کس کا دل زندہ رہنے کو نہ چاہے گا۔

شروع فروری کی ایک ٹھٹھری ہوئی صبح تھی۔ محترم

بڑھتی ہوئی اذیت سے زچ اور نقاہت سے نڈھال تھے۔ علالت نے تشویشناک صورت اختیار کر لی تھی۔ میں حاضرِ خدمت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ وصیت کے انداز میں باتیں کہہ رہے تھے میرا دل سخت بوجھل اور طبیعت اُداس تھی۔ ان کی ایک ایک بات پر یوں محسوس ہوتا' جگر کٹ رہا ہے۔

ایسے میں اُنہیں کچھ یاد آیا۔ ہمیشہ سے' جب سے میں نے حاضری دینا شروع کی تھی یہ دستور رہا کہ آئندہ ماہ شائع ہونے والا طلوع اسلام یا اس کا مسودہ ہمیشہ مجھے پڑھواتے اور مشورہ لیتے۔ میں اس طریق کے لئے بے حد ممنون رہتا تھا اور اسے اپنے پر اُن کا احسان اور شفقت سمجھتا۔

لیکن علالت کے دوران یہ دستور ٹوٹ گیا تھا۔ بس یاد آیا' تو اک دم بات کرتے کرتے رک گئے۔ اشارہ سے شیخ صاحب کو کہہ کر طلوع اسلام کا شمارہ منگوایا۔ اسے ہاتھ میں لے کر کچھ دیر بڑی محبت اور حسرت سے دیکھتے رہے۔ پھر مجھے دیا اور اشارہ کیا کہ میں ورق گردانی کر کے مشورہ دوں۔

کھولا تو صفحہ اول پر بہ عنوانِ لمعات' حالات حاضرہ پر تبصرہ حسب سابق موجود تھا۔ وہی گہرائی۔ وہی گیرائی۔ وہی شائستگی۔ وہی شان موجود تھی۔ تازگی بھی تھی اور تمازت بھی۔ قرآن کریم کے ترازو میں تُلا ہوا انصاف کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا تھا۔ حق گوئی اور بے باکی سے نہایت کھری اور نڈر زبان میں موجود تھا۔

میں نے سوچا اس حالت میں بھی چمنِ طلوع اسلام کی آبیاری کئے جا رہے ہیں۔ قلتِ جاں کے باوجود خونِ جگر کا ہدیہ پیش کئے جا رہے ہیں۔ دم بخود ہو کر پوچھا: بابا جی خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ نقاہت کے باوجود چہرہ اک عزمِ صمیم سے دمک اُٹھا۔ رُخِ روشن پہ اُمیدِ فردا کی سُرخی جھلکنے لگی۔ سہارا لے کر اُٹھ بیٹھے۔ آنکھیں اشکبار تھیں لیکن لب ہمیشہ کی طرح تبسم کناں تھے۔ جلال سے کہنے لگے۔ ''ذرا دیکھو اپنے چاروں طرف۔ دیکھو! میں نے کیسے ان گنت۔ کتنے خوبصورت چراغ جلا دیئے ہیں۔ اب بھی تاریکیوں سے ڈرتے ہو۔ اب بھی بے یقینی میں مبتلا ہو۔ ظفر صاحب' اطمینان رکھو۔ اب اندھیرے کبھی نہیں لوٹیں گے۔ اب روشنیاں کبھی ماند نہیں پڑیں گی۔ یقیناً میرے رب کا قول پورا ہو کر رہے گا۔'' پھر کہا۔ ''سنو! اب منزل زیادہ دور نہیں۔ ہمت سے کام لیں راہیں خود بخود روشن ہو جائیں گی۔''

اپنے آنسوؤں کی دھند میں اُن کی طرف دیکھا تو اشکِ رواں کی لہر جاری تھی مگر چہرہ پر ایک سکون۔ ایک عزمِ مصمم اور دل کش روشنی تھی۔ کہنے لگے۔ ''بھئی میرا آپ لوگوں سے بچھڑنا کیسا۔ مجھے جانا بھی کہاں ہے۔ میرا دل۔ میری روح۔ میری آرزوئیں۔ میری تمنائیں سبھی تو اس قرآنی مشن میں سموئی گئی ہیں۔ میں تو سدا اس مہم میں حاضر و موجود رہوں گا۔ قرآن کریم کی مشعلِ نور پاش اٹھا کر منزلِ انسانیت کی طرف بڑھتے جائیے۔ مستقل اور مسلسل جدوجہد' اَن تھک اور ان مٹ لگن۔ جذبِ صادق اور یقینِ لازوال۔ میرے رفیقو! تم مجھے ہمیشہ ہمراہ پاؤ گے۔ اپنے قدموں کی آواز کے ساتھ میری چاپ بھی ضرور سنو گے۔ میرا دل ہمیشہ تمہارے ساتھ دھڑکے گا۔ یقین مانو! بہاریں آ کے رہیں گی۔ صبحِ نور طلوع ہو کر رہے گی۔''

مجھ غم نصیب کی اُن سے یہ آخری ملاقات تھی۔ اس

کے بعد وہ شفقتوں کے در مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ آفتابِ کرم روٹھ گیا اور میرے بابا جی نے مجھ سے بول چال بند کر دی۔ ع

''میں نے فانؔی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات''

اے روحِ پرویزؔ مطمئن رہ، یہ علمِ قرآنی ہمیشہ بلند رہے گا۔ یہ قندیلیں ہمیشہ روشن رہیں گی اور تیرے جاں نثار صدقِ دلی اور یقینِ محکم سے پیہم آگے بڑھتے رہیں گے۔

جب تک رگِ زیست میں ایک بھی سانس باقی ہے تیرے میکشوں کا یہ قافلۂ جاں فروش مُسلسل رواں دواں رہے گا۔ یہ مشن جاری وساری رہے گا ھی حتی مطلع الفجر۔ اور جب تک یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا نہ اُٹھے۔

''اچھے بابا جی! ہم آپ کو مایوس نہ کریں گے۔

یہ ہمارا عہد ہے۔

ہمارے اور آپ کے درمیان خُدا کی

کتاب ضامن ہے۔''

الوداع اے محسنِ عظیم۔ الوداع

الوداع اے اُستادِ کریم۔ الوداع

〈انا للہ وانا الیہ راجعون〉

نوٹ: یہ تاثرات پرویز علیہ الرحمتہ کی وفات فروری ۱۹۸۵ء کے موقع پر قلمبند کئے گئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبدالعزیز خالدؔ

منظُوم بیادِ

غلام احمد پرویزؔ

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے
اک خدا آگاہ، روشن فکر مردِ خود گرے
دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات
اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
شمع رکھی جس نے روشن فِکر قرآنی کی تاحینِ حیات
طعنے گمراہی کے سُنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا
مہر خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لیے
(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
کیا دماغِ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)
جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا
قرض مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا
زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ
بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ
باوجودِ بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر
جُز دو حرفِ لا الٰہ
کوہکن کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویزؔ تھا
اور اسی باعث تھی شیرینِ خرد اس پر فدا
صاحبِ فرہنگ، اندیشہ سگالے، عاقلے
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اسے
وہ وفاداری بشرطِ استواری کی مثال
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال
تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی
آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اِسلام کا مقصد و منتہٰی

حق کی مخالفت کرنے والوں کے پاس، حق کی تردید اور اپنے باطل دعویٰ کی تائید کے لئے دلائل و براہین تو ہوتے نہیں۔ اس لئے وہ اس کے خلاف بہتان طرازی اور افترٰی پردازی سے کام لیتے ہیں۔ یہی ان کے پاس سب سے بڑا حربہ ہوتا ہے۔ یہی حربہ ہے جو طلوع اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لئے جو ان مخالفین کی طرف سے پیدا کی جاتی ہیں۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً طلوع اسلام کے مقصد کی وضاحت کر دی جائے۔ آج جبکہ ماہنامہ طلوع اسلام کا نئے سال کا دوسرا پرچہ شائع ہو رہا ہے ہم اس مقصد کو ایک بار پھر دہراتے ہیں۔ حدیث و سنت کے بارے میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ:

(۱) قرآن کریم خدا کی طرف سے تمام نوع انسانی کے لئے آخری اور مکمل ضابطۂ دین ہے اس کی اتباع کے بغیر کامیابی اور سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔

(۲) قرآن کریم چونکہ تمام نوع انسانی کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ضابطۂ دین ہے اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دیئے گئے ہیں۔ اس سے منشائے خداوندی یہ ہے کہ یہ اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جزئی قوانین مختلف زمانوں کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یہ جزئیات اسلامی نظام شورائیہ متعین کرے گا۔

(۳) سب سے پہلے اس قسم کا نظام، نبی اکرمؐ نے متعین فرمایا۔ اور قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے، جزئی قوانین قرآن کے حکم کے مطابق اپنی بصیرت اور صحابہؓ کے مشورے سے مرتب فرمائے۔

(۴) رسولؐ اللہ کے بعد یہی سلسلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں جاری رہا۔ اور انہوں نے جن جزئی قوانین کے متعلق دیکھا کہ ان میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا، جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ ان میں تبدیلی کر لی اور جہاں کوئی نیا تقاضا سامنے آیا۔ اس کے لئے نیا قانون وضع فرمالیا۔

(۵) خلافت راشدہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب جو اسلامی نظام علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ وہ وضع قوانین کے لئے

رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدینؓ کا طریقہ اختیار کرے گا۔ یعنی وہ قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کی ضرورتوں کا جائزہ لے گا۔ اگر پہلے سے مرتب شدہ قوانین ان ضرورتوں کو کما حقہٗ پورا کریں گے تو وہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دے گا اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے گا تو وہ تبدیلی کر لے گا اور نئے تقاضوں کے لئے نئے قوانین مرتب کرے گا۔

(۶) جب تک یہ اسلامی نظام قائم نہ ہو، کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ امت جن جزئی قوانین پر کاربند ہے ان میں ردوبدل کر کے ملت میں مزید انتشار اور تفرقہ انگیزی کا موجب بنے (اس اصول کی روشنی میں ظاہر ہے کہ جو لوگ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ طلوع اسلام کہتا ہے کہ تین نمازیں پڑھو اور نو دن کے روزے رکھو وہ کذاب ہیں اور افترا پرداز)۔

(۷) رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ کے عہد مبارک کا ریکارڈ ہماری کتب روایات (وکتب سیر وتاریخ) میں منضبط ہے۔ ان میں کتب روایات (احادیث) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرما کر اپنی امت کو دیا۔ اور نہ ہی صحابہ کبارؓ نے مرتب فرمایا۔ یہ مجموعے حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد، انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئے۔ ان مجموعوں میں دو قسم کی احادیث ملتی ہیں، ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے۔ دوسری وہ جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ سے ہے۔ پہلی قسم کی روایات کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے۔ باقی رہیں دوسری قسم کی روایات، سو یہ حقیقت ہے کہ حضورؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان مجموعوں میں ایسی روایات بھی ملتی ہیں جو حضورؐ کی سیرت کو داغدار کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی تمام روایات غلط ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کے پرکھنے کا معیار خود قرآن ہے۔ جو روایات اس معیار پر صحیح اترتی ہیں، وہی حضورؐ کی سیرت کو صحیح شکل میں پیش کرتی ہیں۔ اس قسم کی روایات سے قرآن کے آئینے میں حضورؐ کی جو سیرت مرتب ہو گی وہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے نمونہ (اسوۂ حسنہ) پیش کرے گی کہ ایک پاکباز اور بلند کردار انسان کی زندگی ایسی ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

یہ ہے اس باب میں طلوع اسلام کا مقصد۔ جو شخص اس کے خلاف کوئی بات طلوع اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے، وہ جھوٹ بولتا اور بہتان تراشی کرتا ہے۔

ہماری گذارش یہ ہے کہ جسے طلوع اسلام کی مخالفت کرنی ہے وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر مخالفت کرے، اور جسے اس کا ساتھ دینا ہے۔ وہ بھی اس مقصد کو سمجھ کر اس کا ساتھ دے۔

والسلام علیٰ من تبع الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوائے دل نواز

اس وقت، امریکہ، اسرائیل، اور بھارت کا جو محور (Axis) پاکستان کو بری طرح اپنے گھیرے میں لئے جا رہا ہے یہ صورت حالات بڑی تشویش انگیز ہے، اور ذمہ دار حضرات اس کے مداوا کے لئے مختلف تدابیر سوچ رہے ہوں گے لیکن جہاں تک ہم غور کر سکتے ہیں اس کا ایک ہی توڑ ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں بلا مزید تاخیر وہ معاشی نظام رائج کر دیا جائے جسے قرآن ان مصائب و مشکلات کا واحد حل قرار دیتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال نے اپنے 28 مئی 1937ء کے خط میں قائداعظم کو لکھا تھا کہ:

> شریعت اسلامی کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو اس کی رو سے ہر فرد مملکت کو اس کے رزق کی ضمانت (مملکت کی طرف سے) مل جاتی ہے..... اسلام کے لئے معاشی جمہوریت (یعنی رزق کے سرچشموں کا عوام کے لئے عام ہو جانا)..... کوئی انقلاب نہیں ہو گا بلکہ حقیقی اور خالص اسلام کی طرف مراجعت ہو گی۔

اور قائداعظم نے اپنی آخری تقریر میں (جو انہوں نے یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر کی تھی) فرمایا تھا کہ:

> مغرب کے معاشی نظام نے نوع انسانی کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں..... اس نظام کی رو سے ہم اپنا نصب العین، یعنی عوام کی مرفہ الحالی اور اطمینان، کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمیں اپنا راستہ آپ تراشنا چاہئے اور دنیا کے سامنے وہ نظام پیش کرنا چاہئے جو اسلام کے، نوع انسانی کی مساوات اور عدل عمرانی کے تصور پر مبنی ہو۔

یہ الفاظ کہ اسلام اپنا مخصوص معاشی نظام رکھتا ہے، ہم یہاں برسوں سے مختلف زبانوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن وہ نظام درحقیقت ہے کیا۔ اس کے متعلق آج تک کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ طلوع اسلام ایک عرصہ سے اس نظام کو پیش کرتا چلا آ رہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کی رو سے ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی اور اس کی ذات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اگر کوئی مملکت اس ذمہ داری

کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتی یا اس فریضہ کی ادائیگی نہیں کرتی تو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں ہوسکتی۔اس لئے کہ اسلامی مملکت وہی ہو سکتی ہے جس کے کاروبار میں صفات خداوندی منعکس ہو رہی ہوں اور ان صفات میں سب سے پہلی اور بنیادی صفت' رب العالمینی کی صفت ہے یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت۔اس میں انسان کے جسم اوراس کی ذات دونوں کے تقاضوں کا پورا کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایک مملکت اس اہم فریضہ سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔

ہم اس حقیقت کو برسوں سے دہرائے جا رہے ہیں لیکن ارباب اقتدار اور مذہب پرست طبقہ دونوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ارباب اقتدار کی طرف سے اس لئے کہ اس سے خود ان کے مفاد پر زد پڑتی ہے اور مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس لئے کہ وہ اس مذہب کا علمبردار ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا (اور جو اس دین کی نقیض ہے جسے نبی اکرمؐ نے خدا سے لے کر دنیا کو دیا تھا) اور اس کے اپنے مفاد خود اس سرمایہ دار طبقہ سے وابستہ ہیں۔لیکن ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر پہلے اس کی ضرورت شدید تھی تو اب اشد ہے کہ اس قرآنی نظام کو یہاں بلا مزید تاخیر جاری کر دیا جائے ورنہ' موجودہ نظام کے ماتحت یہاں عوام کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سیلاب بلا کے لئے خود دعوت بن جایا کرتی ہے امریکہ' اسرائیل اور ہندوستان کے مشؤم عزائم کا یہی ایک توڑ ہے۔

بہ ملازمانِ سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل نوازے

قرآنی نظام ربوبیت ہی وہ ''نوائے استوار'' ہے جس سے ہم دلوں کی تسخیر کر سکتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث، شاہ ولیؒ اللہ اور اقبالؒ

طلوع اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دین کے غیر متبدل اور ابدی اصول قرآن کریم کے اندر ہیں اور ہر زمانے کا اسلامی نظام اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، ان اصولوں کی جزئیات مرتب کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے ان جزئیات کو مرتب فرمایا۔ اگر بعد کے زمانے کا اسلامی نظام یہ سمجھے کہ اس کے زمانے کے حالات کا تقاضا ہے کہ ان جزئیات میں کچھ تبدیلی کر لی جائے تو وہ ایسا کرنے کا مجاز ہے (جیسا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے بعض فیصلوں میں تبدیلی کی تھی) ہمارے مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ اس مسلک سے انکارِ حدیث لازم آتا ہے۔ اس لئے وہ طلوع اسلام کو ''منکرِ حدیث'' کہتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ یہ مسلک سب سے پہلے طلوع اسلام نے اختیار کیا ہے یا اس سے پہلے بھی کسی نے ایسا کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے خطبات (تشکیل جدید الٰہیات) میں لکھتے ہیں:

> ''احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ ﷺ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولیؒ اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ

ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہی کہنا درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطبات اقبال، صفحہ 164-163)

آپ نے غور فرمایا کہ جو مقصد طلوع اسلام نے پیش کیا ہے امام ابوحنیفہؒ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ اقبالؒ کا بھی وہی مسلک تھا۔ اس سے آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ اگر اس مسلک کا نام انکار حدیث ہے تو اس سے کتنی کتنی بڑی ہستیاں منکرینِ حدیث قرار پاتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہودیوں کی حکومت۔۔قرآن کے آئینے میں

سورہ فاتحہ میں ''غیر المغضوب علیھم ولا الضآلینؔ'' ۔کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں مغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں اور ضآلین سے مراد عیسائی۔قرآن کریم کی رو سے یہ تخصیص صحیح نہیں۔اس میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ غضب خداوندی کے مستوجب کون لوگ ہوتے ہیں۔۔یا یوں کہیئے کہ وہ کون سے جرائم ہیں جن کا نتیجہ خدا کا غضب ہوتا ہے اور راستے سے بھٹک جانے والے (ضآلین)کون۔بنابریں' سورہ فاتحہ میں مذکور (مغضوب علیھم اور ضالین) میں وہ تمام افراد اور اقوام شامل ہیں جن پر قرآن کی رو سے ان اصطلاحات کا اطلاق ہوتا ہے۔ہم ان مقامات میں سے (مثال کے طور پر) صرف دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔

سورہ انفال میں جماعت مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ جب میدان جنگ میں تمہارا مقابلہ دشمن سے ہوتو وہاں سے پیٹھ دکھا کر مت بھاگ اٹھو۔یاد رکھو' جو ایسا کرے گا۔۔فقد باء بغضب من اللہ وما وٰئہ جھنم (۸/۱۶)۔وہ غضب خداوندی کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا'' سورہ نساء میں ہے۔

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزآؤہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ و لعنہ و اعدلہ عذابا عظیما (۴/۹۳)۔

جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اسکی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار کیا گیا ہے۔

لہٰذا' یہ سمجھنا کہ قرآن کریم کی رو سے ''مغضوب علیھم'' سے مراد صرف یہودی ہیں' خود فریبی ہے۔

یہودیوں کے متعلق بھی قرآن کریم میں ہے کہ وہ اپنے متعدد جرائم کی وجہ سے خدا کے غضب کے مستحق قرار پا گئے تھے۔مثلاً جب انہوں نے (حضرت موسٰےؑ کی عارضی غیر حاضری کے دوران) گوسالہ پرستی شروع کر دی تو اس پر کہا گیا کہ۔۔سینا لھم غضب من ربھم و ذلۃ فی الحیوٰۃ الدنیا..... (۷/۱۵۲)۔ان پر خدا کا غضب ہوگا۔یعنی وہ اس دنیا میں ذلیل ہوں گے۔

لیکن اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ جرم کرنے کے بعد اس سے تائب ہو کر صحیح روش اختیار کر لیتے ہیں' انہیں حفاظت اور مرحمت نصیب ہو جاتی ہے چنانچہ اس کے بعد یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں حکومت وسطوت نصیب ہو گئی۔ اسی سینا کے صحرا میں انہوں نے احکام خداوندی سے اعراض اور سرکشی کی راہیں اختیار کیں تو اس پر کہا گیا کہ وضربت علیھم الذلۃ و المسکنۃ و بغضب من اللہ۔ (۲/۶۱)۔ ان پر ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اور اس طرح خدا کا غضب ان پر وارد ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ذلت و مسکنت کی یہ سزا بھی وقتی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد انہیں نہ صرف فلسطین کا علاقہ ہی ملا بلکہ وہ سطوت داؤدی اور شوکت سلیمانی کے بھی وارث ہوئے۔

اس کے بعد ان میں پھر خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں تو ان پر دو دفعہ ایسی تباہی کا عذاب آیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ ان کی پہلی تباہی بابل کے مستبد شاہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں (چھٹی صدی قبل مسیح میں) ظہور میں آئی۔ لیکن اس کے بعد ایران کے شاہنشاہ کیخسرو نے انہیں دوبارہ یروشلم میں بسا دیا اور دوسری تباہی ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں ہوئی جس کے بعد انہیں پھر سرفرازی کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۴۔۷ میں ان دونوں تباہیوں کا ذکر آیا ہے۔

نزول قرآن کریم کے وقت ان سے کہا گیا کہ اگر تم خدا کی ان صداقتوں پر ایمان لا کر' اپنی روش میں تبدیلی کر لو' تو تمہاری ذلت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے اس موقعہ کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔ اور بدستور غضب خداوندی کے مورد بنے رہے۔ اس سلسلہ میں سورہ بقرہ میں کہا گیا کہ اس سے فباء و بغضب علیٰ غضب (۲/۹۰)۔۔ وہ پہلے ہی (اپنے سابقہ جرائم کے نتیجے میں) مغضوب علیہ تھے۔ اس انکار و سرکشی سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

انہوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے انکار کیا بلکہ (مدینہ میں) اسلامی مملکت کے امن پسند شہریوں کی حیثیت سے بھی رہنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں سے عہد شکنی کی۔ پھر کھلے بندوں میدان جنگ تک میں مقابلہ کے لئے آ گئے۔ اس مقام پر جماعت مومنین سے کہا گیا کہ ان کی ان حرکات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ہر منصوبہ ناکام رہے گا۔ انہیں ذلت آمیز شکست ہو گی' اور بری طرح سے خوار ہو کر یہاں سے نکلیں گے۔ اس سلسلہ میں سورہ آل عمران میں کہا گیا کہ ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا۔۔ یہ جہاں بھی جائیں گے' ذلت و خواری ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔۔ الا بحبل من اللہ و حبل من الناس۔۔ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں اہل کتاب سمجھ کر خدا کے نام پر پناہ دے دی یا انہوں نے ویسے ہی کسی قوم سے معاہدہ کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان کی کیفیت یہی رہے گی کہ باء و بغضب من اللہ و ضربت علیھم

المسکنۃ ۔(۳/۱۱۱) خدا کا غضب ان پر مسلط رہے گا اور اس طرح یہ ذلت و مسکنت کی زندگی بسر کریں گے۔ چنانچہ پہلے انہیں مدینہ سے نکالا گیا' پھر خیبر سے اور ازاں بعد پورے کے پورے جزیرہ نمائے عرب سے انہیں باہر نکال دیا گیا۔ صفحۂ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں یہ باعزت زندگی بسر کر سکتے۔ عیسائی ان کے شدید ترین دشمن تھے۔ کیونکہ وہ انہیں حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے کے مجرم قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کی مملکت کے خلاف انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ لہٰذا' ان کے لئے کہیں ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں' نزول قرآن کریم کے زمانے تک یہودیوں کی ذلت آمیز زندگی کا ذکر ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ابدالآباد تک ان کی یہی حالت رہے گی۔ بلکہ خود اسی آیت میں ''الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔'' کہہ کر ان کی ذلت سے بچ جانے کی ایک امکانی شکل کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی فلسطینی زندگی کے زمانے میں سرکشی اور قانون شکنی کی جو زندگی اختیار کر رکھی تھی' اس سلسلہ میں سورہ اعراف میں ہے۔

و اذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الی یوم القیمٰۃ من یسومھم سوء العذاب (۷/۱۶۷)

اور جب تیرے رب نے (بذریعہ وحی) اعلان کر دیا کہ وہ ان پر ''قیامت کے دن تک'' ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں سخت سزائیں دیا کریں گے۔

اس آیت میں ''الی یوم القیمٰۃ'' (قیامت کے دن تک) کے الفاظ سے یہ دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ قیامت تک ایسے لوگوں کی محکومی میں رہیں گے جو انہیں بری طرح ستائیں گے۔ اس لئے ان کی اپنی حکومت کبھی قائم نہیں ہو گی۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے ''قیامت'' کا تصور کیا ہے اور یوم القیمٰۃ سے مراد کیا' اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہہ دیتے ہیں کہ ''تم قیامت تک ایسا نہیں کر سکو گے'' اور اس طرح اس سے یا تو شدت مراد ہوتی ہے یا لمبا عرصہ۔ اسی طرح قرآن کریم میں بھی ''الی یوم القیمٰۃ'' استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں عیسائیوں کے متعلق ہے کہ واغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیمٰۃ ۔(۵/۱۴)۔ ہم نے ان میں ''قیامت کے دن تک'' باہمی بغض و عداوت ڈال دی۔ اسی طرح یہودیوں کے باہمی اختلاف کے متعلق بھی انہی الفاظ میں کہا گیا ہے (۵/۶۴)۔ ''الی یوم القیمٰۃ'' تو خیر پھر بھی ایک محدود مدت ہے' قرآن کریم میں تو ''ابد'' کا لفظ بھی لامتناہی مدت کے بجائے ''لمبے عرصے'' کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں کہ ''میں کبھی ایسا نہیں کروں گا''۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء

کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ''تم میں اور ہم میں باہمی عداوت ہوگی۔ ابدا (۶۰/۴) لیکن اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ حتی تومنوا باللہ (۶۰/۴) تا آنکہ تم اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہی مراد ''یہودیوں پر ان کے دشمنوں کے تسلط'' تا قیامت'' سے ہے۔ یعنی ان پر وہ لوگ مسلط رہیں گے' تا آنکہ یہ اپنی غلط روش کو نہ چھوڑ دیں۔ خود وہ آیت جس میں یہودیوں پر ان لوگوں کے تا قیامت مسلط رہنے کا ذکر ہے' اس مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ اس میں یہ کہہ کر کہ ان لوگوں پر وہ مسلط رہیں گے' یہ کہا گیا کہ۔۔ ان اللہ سریع العقاب۔ خدا کا قانون مکافات غلط اعمال کا بہت جلد بدلہ دے دیا کرتا ہے اور اس کے بعد ہے۔ وانہ لغفور رحیم۔ (۱۶۷/۷) اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سامان حفاظت و مرحمت بھی عطا کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہود پر باز آفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو گئے تھے۔ انکے لئے حفاظت طلبی کے راستے کھلے تھے۔

اس سے اگلی آیت میں بات اور بھی واضح کر دی جہاں کہا کہ و قطعنہم فی الارض امما۔ ان کے جرائم کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مرکزیت فنا ہوگئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر زمین میں منتشر ہوگئے۔۔ منہم الصالحون و منہم من دون ذالک۔۔ یہ نہیں تھا کہ ان کی ساری قوم میں کوئی بھی فرد صالح نہیں تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور کچھ لوگ ویسے۔۔ و بلونٰہم بالحسنٰت و السیٰات۔۔ ان کی تاریخ میں' ان کے لئے بگڑنے اور سنورنے کے مختلف مواقع آتے رہے۔ یہ اس لئے کہ۔۔ لعلہم یرجعون۔ (۱۶۸/۷)۔ تا کہ یہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستے کی طرف آ جائیں۔ اور اس طرح اپنی ذلت و محکومی کو پھر سے عزت اور وقار میں بدل سکیں۔ ''لعلکم یرجعون'' کے الفاظ نے ساری بات واضح کر دی۔ یعنی یہ کہ ان پر ان کی باز آفرینی کے دروازے ابدی طور پر بند نہیں ہو چکے تھے۔ ان کے لئے اس کا امکان باقی تھا۔

جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا۔ اگر کسی قوم کا اجتماعی تشخص ہی نہیں مٹ چکا' تو اس کے لئے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا موقعہ ہر وقت موجود ہوتا ہے۔' یہ خدا کے قانون مکافات کے خلاف ہے کہ کسی قوم کے اسلاف نے دو ہزار سال پہلے کچھ جرائم کئے ہوں' تو ان کی موجودہ نسل سے کہہ دیا جائے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کر لو' تم اپنی ذلت کی زندگی کو بدل ہی نہیں سکتے یہ عقیدہ عیسائیت کا ہے جس کی رو سے کوئی انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کے داغ کو دھو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔ حکومت و سلطنت حاصل کرنے کے لئے کچھ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو قوم بھی ان صلاحیتوں کو پیدا کر لے گی' اسے حکومت مل جائے گی۔ جس میں وہ صلاحیتیں باقی نہیں رہیں گی' ان سے حکومت چھن جائے گی۔ ان صلاحیتوں کے باقی نہ رہنے سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی

ہے' اس کا اندازہ دو ایک تاریخی واقعات سے لگائیے۔۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ فلسطین کے ان مقامات کو جنہیں وہ مقدس سمجھتے تھے' مسلمانوں کے قبضے سے چھین لیں۔ قریب دو سو سال تک ان جنگوں کا سلسلہ (جنہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے) جاری رہا۔ لیکن وہ مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے۔ اس کی وجہ ایک فرانسیسی مصنف (ژواین ویل) کی زبان سے سنئے۔ جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ مصر کے محاذ کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ:

> ایک رات جب ہم ان برجیوں پر جو دریا کے راستے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھیں' پہرہ دے رہے تھے تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک انجن سا لا کر نصب کر دیا اور اس سے ہم پر آگ پھینکنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر ہمارے لارڈ والڈ نے ہم سے یوں خطاب کیا۔۔ ''اس وقت ہماری زندگی کا سب سے بڑا خطرہ پیش آ گیا ہے.....ایسی حالت میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو ہمارا بچاؤ کر سکے۔ آپ لوگوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہئے کہ ہم گھٹنوں کے بل جھک جائیں' اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا کریں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔'' چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے آگ کے یہ شعلے ہم پر برستے رہے اور ہم ہر شعلہ پر گھٹنوں کے بل جھک کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے۔ حتیٰ کہ ہمارے ولی صفت بادشاہ کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ جب اس شعلہ کی گرج سنتا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور روتے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا۔

وہ یہ دعائیں کرتے رہے اور آگ کی اس بارش نے ان کی تمام برجیوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

یہ تیرھویں صدی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کیفیت تھی۔ اس کے پانچ سو سال بعد' جب اٹھارہویں صدی میں' نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ ان علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ ہمیں جامعہ ازہر میں' بخاری شریف کا ختم شروع کر دینا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ہنوز بخاری شریف کا ختم' اختتام تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ مصر کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔

یہ اٹھارہویں صدی کا ذکر ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا ہے تو امیر بخارا نے حکم دے دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ''ختم خواجگان'' پڑھا جائے۔ چنانچہ ادھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں' ادھر ختم خواجگان میں لوگ بیٹھے یا مقلب القلوب' یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے لیکن توپیں جیت گئیں اور یہ دعائیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں۔ (بحوالہ۔ غبار خاطر' مولانا آزاد مرحوم)

اور یہ کچھ مصر اور بخارا تک ہی محدود نہیں۔ اب تو ہمارا عام شیوہ یہ ہو گیا ہے کہ ادھر کوئی قومی مصیبت آئی' اور ادھر ہم نے مسجدوں میں دعائیں مانگنا' مناجاتیں پڑھنا اور اذانیں دینا شروع کر دیں۔۔ سکولوں میں آیۃ الکرسی کے ورد کے لئے چاندنیاں بچھ گئیں اور مزاروں پر ختم خواجگان شروع ہو گئے آپ نے جمعہ کے ہر خطبہ میں خطیب صاحب کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ۔۔ اللھم دمر دیارھم ۔ یا اللہ! تو اسلام کے دشمنوں کی بستیوں کو تباہ کر دے۔۔ اللھم شتت شملھم ۔۔ یا اللہ! تو ان کی اجتماعیت کو منتشر کر دے۔ ہم صدیوں سے اپنے خطبوں میں یہ دعائیں مانگتے اور سامعین ان پر نہایت خشوع وخضوع سے آمین' اللھم آمین کے نعرے بلند کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اسلام کے دشمنوں کی بستیاں دن بدن ترقی کرتی اور ان کی اجتماعیت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اذانوں میں بے شک زلزلہ انگیز قوت اور دعاؤں میں لاریب جمعیت خاطر کا سامان ہوتا ہے لیکن انہی کی اذانوں اور دعاؤں میں جن کے بازو خارا شگاف اور جن کے حوصلے آہن گداز ہوں۔

قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

ایمان کی ضرورت کیوں؟

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ انسان کے لئے ایمان کی ضرورت کیوں ہے؟ سوال بڑا اہم ہے اور گہری فکر اور توجہ کا محتاج۔

ڈارون' اپنی عمر بھر کی تحقیق کے بعد' زندگی کے متعلق ایک نتیجہ پر پہنچا۔ جسے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تفصیل طول طویل ہے اور بعد کی تحقیقات نے اس کی بعض جزئیات کو غلط بھی ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اس کا مرکزی تصور ابھی تک درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ مرکزی تصور وہ ہے جسے ہربرٹ اسپنسر نے بقائے اصلح (Survival of the fittest) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس تصور کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کشمکش حیات میں وہی نوع باقی رہی جس نے اپنے اندر اس قدر قوت پیدا کر لی کہ ماحول کی تخریبی قوتیں اسے پامال نہ کر سکیں۔ اس تصور کے ماتحت' نظریہ یہ وضع اور تسلیم' کیا گیا کہ زندہ وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ قوت حاصل کر لے' جو دوسروں کے مقابلہ میں کمزور ہو جائے' اسے زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔ اس لئے زیادہ قوت رکھنے والے اسے ہڑپ کر سکتے ہیں۔

ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔ چڑیا' کیڑوں مکوڑوں کو نوچ لیتی ہے اور عقاب' چڑیا کو دبوچ لیتا ہے۔ بلی' چوہے کو کھا جاتی ہے۔ کتا' بلی کو جھپٹ لیتا ہے۔ بھیڑیا' کتے کا گلا پکڑ لیتا ہے اور عند الضرورت' شیر' بھیڑیئے (اور جنگل کے ہر جانور) کا خون پی لیتا ہے۔ اسے ''جنگل کا قانون'' کہا جاتا ہے اور جنگل میں ایسا کرنے کو نہ معیوب سمجھا جاتا ہے' نہ مذموم۔ اس قانون کی رو سے اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ کمزور کا وجود ہی اس لئے ہے کہ وہ طاقتور کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بنے۔ کمزور اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے جب تک طاقت ور کو اس کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقت ور ضرورت محسوس کرے' وہ کمزور کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ نظام فطرت میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی کچھ ہو رہا ہے' یہی ہوتا رہے گا۔ نہ بھیڑوں کی ہزار آرزوئیں شیر کو خوئے درندگی سے عاری کر سکتی ہیں' نہ بکریوں کے لاکھ ریزولیوشن بھیڑیوں کی تیزی دنداں کو کند کر سکتے ہیں۔

نظام فطرت کے اسی مشاہدہ و مطالعہ کے بعد' یہ علمائے سائنس' ''بقائے اصلح'' کے نظریہ تک پہنچے۔ اور اسے ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نظریہ کی بنیاد

اس نظام فطرت پر تھی جس کا تعلق حیوانی دنیا سے ہے۔ (یعنی اس دنیا سے جس میں زندگی انسانی سطح تک نہیں پہنچی) حیوانی دنیا میں فطرت کے طبعی قوانین (Physical Law) کا رفرما ہیں ان قوانین میں دیکھا یہ جاتا ہے کہ ''ہو کیا رہا ہے'' (What is) ان میں ''کیا ہونا چاہئے''۔ (What ougth to be) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ قوانین تھے حیوانی زندگی سے متعلق۔ لیکن نوع انسان کی بدقسمتی کہ یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہی قوانین' خود انسانی زندگی پر بھی منطبق (Apply) ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے انسانی زندگی کو بھی سلسلہ ارتقاء (Chain of evolution) کی ایک کڑی قرار دیا' اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ بنیادی طور پر انسان' دیگر حیوانات سے الگ نہیں۔ اس میں اور دیگر حیوانات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق حیوانات کی مختلف انواع (Species) میں ہے۔ جس طرح بنیادی طور پر وہ تمام انواع' حیوان ہی ہیں اور یکساں طور پر طبعی قوانین کے تابع' اسی طرح انسان بھی ایک حیوان ہے اس لئے فطرت کے جو قوانین' حیوانات پر لاگو ہوتے ہیں' انہی کے تابع انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس منطق کی رو سے یورپ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا جو قانون حیوانی زندگی پر صادق آتا ہے' وہی قانون انسانی زندگی میں کارفرما ہونا چاہئے۔ یعنی یہ قانون کہ زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ طبعی قوت فراہم کر لے۔ کمزور کو صرف اس وقت تک زندہ رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جب تک طاقتور کو اس کی جان کی ضرورت نہ پڑے۔ جس وقت طاقت ور کی ضرورت یا مصلحت کا تقاضا ہو' وہ کمزور کو اپنا لقمہ بنا سکتا ہے۔ ایسا کرنا نہ معیوب ہے نہ مذموم۔ اس لئے کمزور کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ آواز اٹھائے بھی تو اسے وہ چیخ سمجھنا چاہئے جو مرغی کے حلق سے اس وقت (بے اختیار) نکلتی ہے جب اسے بلی دبوچ لے جاتی ہے۔ اگر بلی' اس کی اس چیخ سے متاثر ہو کر اسے چھوڑ دیتی ہے' تو یہ اس کی حماقت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھوکوں مرے گی۔ اگر وہ مرغی کہیں مرافعہ (اپیل) بھی کرے تو بلیوں کی کوئی عدالت اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔

یورپ نے ''جنگل کے اس قانون'' کو' ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر کے' انسانی دنیا میں نافذ کر دیا۔ حیوانوں کی دنیا میں یہ صورت تھی کہ وہ مختلف انواع میں بٹے ہوئے تھے' جن میں ایک نوع دوسری نوع سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور طاقتور نوع' کمزور نوع کو کھاتی تھی۔ اس میں (بجز شاذ حالات کے) ایک نوع کے افراد' آپس میں ایک دوسرے کو کھانے نہیں لگ جاتے تھے۔ بلیاں چوہوں کو تو کھاتی تھیں' لیکن چوہے ایک دوسرے کو نہیں کھاتے تھے۔ انسان سب ایک نوع سے متعلق تھے' اس لئے ''جنگل کے قانون'' کے مطابق بھی ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا کہ اس ایک نوع کے افراد' ایک دوسرے کو کھانے لگ

جاتے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لئے' یورپ نے' نوع انسانی کو مختلف اقوام میں تقسیم کر دیا اور ہر قوم کو ایک جداگانہ نوع تصور کرلیا گیا۔ اس کے بعدصورت یہ ہوگئی کہ جس قوم نے زیادہ قوت فراہم کر لی' اسے حق حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے سے کمزور قوموں کو ہڑپ کر جائے۔ اس طرح ''جنگل کے قانون'' کا انسانی دنیا میں عام چلن ہو گیا۔ اس وقت یہی قانون ساری دنیا میں رائج ہے۔ (خود ایک قوم کے اندر بھی' مختلف طبقات نے کس طرح اس قانون کو اپنا رکھا ہے اور اسکی رو سے' صاحب قوت و اقتدار طبقہ' کمزوروں کو دبوچ لینا کس طرح اپنا حق سمجھتا ہے' ہم سردست اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے اس وقت..... ہم اپنے موضوع کو اقوام تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔) بہرحال' یہ ہے اس وقت دنیا کا نقشہ' اسے اگر ایک فقرہ میں سمٹانا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ

اس وقت جنگل کے قانون پر ساری دنیا کا ایمان ہے

اس سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا' کہ ''ایمان'' کسے کہتے ہیں۔

اس نظریہ زندگی اور قانون حیات' کے خلاف ایک اور نظریۂ زندگی ہے۔ اس نظریۂ زندگی کے اصول یہ ہیں کہ:

(۱) زندگی بے شک ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکر انسان تک پہنچی ہے لیکن انسانی منزل میں پہنچ کر' اس میں ایک ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے جو اس کی سابقہ کڑیوں میں نہیں تھی۔ اسے آپ (محض سمجھنے کی غرض سے) ''انسانیت کی زندگی'' سے تعبیر کیجئے۔ (ویسے' اس خصوصیت کبریٰ کو انسانی ذات کہا جاتا ہے)

(۲) انسان کی جسمانی زندگی تو حیوانات کی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے لیکن اس کی ''انسانیت کی زندگی'' پر وہ قوانین منطبق نہیں ہوتے۔ اس کے لئے ایک اور ضابطۂ قوانین ہے۔ اسے مستقل اقدار (Permanent Values) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیوانات میں اقدار (Values) کا تصور نہیں ہوتا۔ وہ صرف طبعی تقاضوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اقدار کا تصور انسانی زندگی کی خصوصیت ہے۔

(۳) حیوانی زندگی' طبعی قوانین کے تابع چلنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں ''کیا ہونا چاہئے'' (What ought to be) کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انسانی زندگی میں اختیار و ارادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی انسانی زندگی کو جس قسم کے قوانین کے تابع رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ یعنی یہ چاہے تو انسانی زندگی کو ''جنگل کے قانون'' کے تابع رکھ لے اور چاہے تو اسے مستقل اقدار کے تابع لے آئے۔

(۴) ان مستقل اقدار کی رو سے' تمام انسان ایک نوع کے افراد ہیں اس لئے انہیں نہ اقوام میں تقسیم کرنے سے جداگانہ انواع قرار دیا جا سکتا ہے' اور نہ ہی ایک قوم کے اندر' مختلف طبقات کی ناقابلِ عبور حدیں (Water-Tight compartments) کھڑی کی جا سکتی ہیں

(۵) حیوانی زندگی میں' قانون حیات' بقائے اصلح ہے۔۔یعنی زندہ رہنے کا حق اسی کو ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن مستقل اقدار کی رو سے قانون حیات ونظریہ بقا یہ ہے کہ۔

ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔(۱۳/۱۷)

باقی وہی رہ سکتا ہے جو نوع انسان کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہو۔

یعنی اس میں قانون حیات ''بقائے انفع'' ہے۔۔ جو فرد یا جماعت نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش کام کرے' اسے بقا نصیب ہوسکتی ہے۔

(۶) مستقل اقدار کی رو سے' نوع انسان' ایک کارواں کی طرح مصروف سفر رہتا ہے۔اس کارواں میں اگر کوئی راہرو' کسی وجہ سے تھک کر پیچھے رہ جائے' تو دیگر افراد کارواں کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے سواری کا انتظام کریں تاکہ وہ درماندہ راہرو' دیگر افراد کارواں کے دوش بدوش' سفر کرنے کے قابل ہو جائے۔اگر کوئی درندہ اس درماندہ راہرو کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کرے' تو پورے کا پورا کارواں اس کی مدافعت وحفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

اس میں افراد کارواں کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کے ذمے مختلف فرائض عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس تقسیم کار سے' ایک کو دوسرے پر غلبہ وتسلط کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔ یہ تقسیم عمل' کارواں کے حسن نظم کے لئے ہوتی ہے۔اور بس

(۷) (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) مستقل اقدار کی رو سے' قوت' صرف کمزوروں کی حفاظت کے لئے استعمال کی جاتی ہے' کسی کو کمزور کرنے اور پھر اس کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے (Exploitation) کے لئے استعمال نہیں کی جاتی۔

(۸) اس نظریہ زندگی کی رو سے' مقصد حیات یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے..... پوری انسانیت کی زندگی کو بلند سے بلند تر کرتا جائے۔جس طرح پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اس میں کہیں نشیب و فراز اور ناہمواریاں نہیں ہوتیں' اسی طرح جب انسانیت کی زندگی کا معیار بلند ہوتا ہے تو اس میں پوری انسانیت کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

(۹) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس سے انسان' زیادہ سے زیادہ محنت کر کے' دوسروں کی کمی کو پورا کر کے انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کرے۔

مستقل اقدار کی رو سے' اصول یہ ہے کہ جس قدر کوئی انسان' دوسروں کے لئے نفع بخشیوں کا سامان بہم پہنچائے' اس سے اسی قدر اس کی انسانی زندگی سنور جاتی اور اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی طبعی زندگی کے بعد' زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔اپنے مستقبل کو سنوارنے کا خیال وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے انسان' دوسروں کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔جسے بظاہر ''دوسروں کی خاطر'' کچھ کرنا

سمجھا جاتا ہے' وہ درحقیقت خود اپنے لئے ہوتا ہے۔

یہ ہے دوسرا نظریۂ زندگی یا قانون حیات جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ اس نظریۂ کو مسلمہ حقیقت سمجھنا' ایمان کہلاتا ہے۔

قرآن' جنگل کے قانون والے نظریہ زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے پیش کردہ نظریہ کو اسلام کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے کفر اور حیوانی سطح زندگی کو مرادف قرار دیا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں ہے۔

والذین کفروا۔ یتمتعون و یأکلون کما تأکل الانعام (۱۲/ ۴۷)۔

جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زندگی سے متمتع ہوتے ہیں۔

چونکہ قرآن کریم اس نظریۂ زندگی کو غلط قرار دیتا ہے اس لئے اسے صحیح ماننے والوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ''وہ باطل پر ایمان'' رکھتے ہیں۔

والذین اٰمنوا بالباطل و کفروا باللہ اولٰئک ھم الخاسرون۔ (۲۹/۵۲)۔

جو لوگ اس باطل نظریۂ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے عطا کردہ صحیح نظریہ زندگی سے انکار کرتے ہیں' وہ آخرالامر سخت نقصان اٹھائیں گے۔

یوں تو ایمان بالباطل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلا آ رہا ہے' لیکن پہلے اس کی حیثیت انفرادی سی ہوتی تھی' مغرب نے' طبعی کائنات میں کارفرما جنگل کے قانون کو انسانی زندگی پر منطبق کر کے' اسے عالمگیر پوزیشن دے دی۔ جسے تہذیب مغرب کہا جاتا ہے' وہ اسی ایمان بالباطل ۔۔ یعنی جنگل کے قانون کو نظریۂ حیات سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔ مغرب نے اسے سائنس کا ایک عظیم انکشاف قرار دے کر بطور فلسفۂ حیات اختیار کیا۔ اسی کو مادی نظریۂ حیات یا (Materialistic concept of life) کہا جاتا ہے۔۔ اور چونکہ بدقسمتی سے اقوام مغرب دنیا میں اقوام غالب کی حیثیت سے پھیل گئیں اس لئے ان کا یہ فلسفۂ زندگی یا ایمان بالباطل تمام اقوام عالم میں پھیل گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب یہ قانون ساری دنیا کا عام چلن ہو گیا ہے۔ یوں تو اقوام یورپ نے اس قانون کو نظریۂ ارتقا ہی کی روشنی میں اپنایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے غلط عقائد نے جو فضا پیدا کر دی تھی۔ وہ اس نظریہ کے لئے بڑی سازگار تھی۔ عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے ایمان پر ہے' یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت' بنی اسرائیل کی نسل کے لئے مخصوص ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان عقائد کی رو سے' انسانی اعمال کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہودیوں کے گھر میں پیدا ہو جانے' یا حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آنے کے بعد' انسان کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جس قسم کے چاہے کام کرے' اس سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہو گی۔ انہی عقائد کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ عیسائیوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ (اس

زمانے میں یہودیوں کی سلطنت کہیں نہیں تھی' اس لئے یہ ثنویت عملاً عیسائی مملکتوں میں رائج ہوئی)۔اس سے' اقوام مغرب میں انسانی تمدن کا نقشہ یوں مرتب ہوا کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت لئے ہوئے' اور امور سیاست میں کھلی چھٹی کہ جس طرح جی چاہے کریں۔۔۔عیسائیت نے یورپ میں یہ فضا پیدا کر دی۔اس پر نظریۂ ارتقاء نے ''جنگل کے قانون'' کو بطور نظام فطرت پیش کر دیا۔لہٰذا' یہی قانون وہاں کی زندگی کا عام چلن ہو گیا۔

اس ''ایمان بالباطل'' نے دنیا کو کس طرح جہنم بنا رکھا ہے' اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ہم سب اس جہنم کے اندر ہیں اس لئے اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔اس وقت حالت یہ ہے کہ ساری دنیا ایک وسیع وعریض جنگل بن چکی ہے۔جس میں بعض قوموں نے (کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کر کے) شیروں کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ان سے دوسرے درجے پر بعض قومیں بھیڑیوں کی سطح پر ہیں اور باقی تمام اقوام عالم' بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ان کے رحم وکرم پر زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ان شیروں اور بھیڑیوں کا جب جی چاہے کسی بھیڑ یا بکری کو دبوچ لیتے ہیں۔وہ بے چاری ممیاتی ہوئی دم توڑ دیتی ہے اور باقی ڈری اور سہمی ہوئی جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ جاتی اور اپنی باری کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ''جنگل کے ان بادشاہوں'' سے کوئی پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔تاریخ کے اوراق' طاقت ور قوموں کی طرف سے اس قسم کی ہمہ گیر سبعیت و بربریت اور دوسری طرف کمزور قوموں کی اس حد تک بے بسی اور بے کسی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔سڑک پر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو راہ گذر انہیں چھڑا دیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پولیس کا سپاہی انہیں گرفتار کر لیتا' اور عدالت' زیادتی کرنے والے کو سزا دے دیتی ہے۔لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ ایک درندہ صفت ملک' لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ذبح کئے جا رہا ہے اور کسی میں ہمت نہیں پڑتی کہ مظلوم کی فریاد کو پہنچے۔ادھر اسی امریکہ کو اور برطانیہ کو عربوں کا گلا دبانے کی ضرورت پڑی تو فلسطین کی لاکھوں پرامن آبادی کو دھکیل کر باہر کر دیا ور وہاں جدید اسرائیلی حکومت قائم کر دی۔اس کے بعد اس نومولود کو اس قدر طاقتور بنا دیا گیا کہ وہ اب اس ''جنگل کا بادشاہ'' بن رہا ہے۔اس کے خلاف نہ صرف یہ کہ کسی کو انگلی نہیں اٹھانے دی جاتی بلکہ نام نہاد فریادگاہ (یو۔این۔او) میں زبانیں گنگ کر دی جاتی ہیں کہ کوئی اس خنجر بدست لاڈلے کے خلاف لب کشائی تک بھی نہ کر سکے۔اگر وہاں کوئی ریزولیوشن پاس بھی ہو جاتا ہے تو یہ اس کاغذ کے پرزے کو مسل کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے اور وہ سب قومیں جنہوں نے یہ ریزولیوشن پاس کیا تھا اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہیں۔یہ ہے اس ''جنگل کے قانون'' پر ایمان کا نتیجہ! ان اقوام نے اپنی کہنہ روایات میں ہمدردی بنی نوع انسان جیسے جو الفاظ سن رکھے تھے' ان کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب بھیڑیا' بھیڑوں کے گلے پر حملہ کر رہا ہوتا ہے تو

ریڈ کراس کا ایمبولینس دور کھڑا محو تماشا ہوتا ہے۔ جب وہ ایک بھیڑ کو اٹھا کر لے جاتا ہے تو یہ ایمبولینس' ہمدردئ نوع انسان کے جذبے سے سرشار' آگے بڑھتا ہے تاکہ جو زخمی بھیڑیں زمیں پر تڑپ اور سسک رہی ہیں' ان کے حلق میں پانی ٹپکائے۔ یہ ایمبولینس انہیں بھیڑیوں کا مہیا کردہ ہوتا ہے جو ان بھیڑوں کے خون پر پلتے ہیں' دنیا ان کے اس جذبۂ ہمدردی کو سراہتی اور ان کی شان میں مدح وستائش کے قصیدے پڑھتی ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے جرائم کی جو فہرست پیش کی ہے' اس میں ان کے ایک جرم کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ۔۔ثم انتم ھٰولاء تقتلون انفسکم و تخرجون فریقا منکم من دیارھم۔۔تم وہ لوگ ہو کہ خود اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو اور ان میں سے بعض کو ان کے گھر بار سے نکال باہر کرتے ہو۔۔تظٰھرون علیھم بالاثم و العدوان۔تم میں سے ایک گروہ یہ کچھ کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس ظالم اور متبد گروہ کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔۔ و ان یأتوکم اسریٰ تفٰدوھم ۔۔جب ان مظلوموں کو جنہیں تم نے ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' دوسرے لوگ قیدی بنا کر لے جاتے ہیں' تو تم چندے اکٹھے کرتے ہو تاکہ ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے آزاد کرایا جائے۔ اس طرح تم اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔۔وھو محرم علیکم اخراجھم۔(۲/۸۵)۔حالانکہ تم نے جو انہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا' تو وہ تمہارے لئے کیسے جائز تھا!

بعینہٖ اسی قسم کے ''ثواب کے کام'' موجودہ دور کے قزاق اور رہزن کرتے ہیں۔ پہلے' لاکھوں فلسطینی عربوں کو' ان کے گھر بار سے نکال کر ویرانوں میں دھکیل دیا اور اس کے بعد ان ''پناہ گزینوں'' کی امداد کے لئے خیراتی فنڈ کھول کر دنیا سے داد لی جاتی ہے کہ دیکھو! ہمارا سینہ مظلوموں اور غریبوں کے درد سے کس قدر لبریز ہے۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو!
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

لیکن ''جنگل کے قانون'' کے اس قسم کے مظاہرے دیگر اقوام کے ہاں جا کر ہی نہیں ہوتے' ان بالادست اقوام کے خود اپنے گھر بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جب ایمان یہ ٹھہرا کہ انسان ایک حیوان ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' قانون حیات۔تو پھر دلوں میں کسی ایسے آئین اور ضابطہ کا احترام کیسے پیدا ہوسکتا ہے جو افراد معاشرہ کے حیوانی جذبات کی بے محابا تسکین کی راہ میں حائل ہو۔اس کا نتیجہ ہے کہ خود اقوام مغرب میں جرائم کی تعداد اس قدر ہوشربا تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ یہ اتنی بڑی بڑی قوتوں کی حامل قومیں' اس سیلاب بے پناہ کی روک تھام سے عاجز آ چکی ہیں۔ ہمارے ایک بالغ نظر دوست حال ہی میں امریکہ گئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہاں قوم کی حالت عجیب ہے۔ سب لوگ عجب انتشار کا شکار ہیں۔ جرائم کی رفتار سن کر آپ دنگ

رہ جائیں گے۔۔یعنی تیس لاکھ۔۔ ہر گھنٹہ کے بعد قتل۔ اکیس منٹ کے بعد ڈکیتی۔ چار منٹ کے بعد زنا بالجبر (زنا بالرضا کا تو حساب و شمار ہی نہیں)۔ ہر دس سیکنڈ کے بعد نقب زنی۔ اور ہر سیکنڈ کے بعد چوری۔ اس سال چالیس ہزار افراد حادثات کا شکار ہوئے۔۔۔اور کیا لکھوں؟

یہ امریکہ کی حالت ہے۔ برطانیہ میں جنسی بدنہادی اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں لواطت کو قانوناً جائز قرار دیا گیا ہے۔ (حالانکہ وہاں عورتوں کی تعداد اب بھی مردوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے) اور اس کے لئے وجۂ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اس کی روک تھام حکومت کے بس کی بات نہیں رہی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے قانوناً جائز قرار دے کر' اس فعل شنیع کے مرتکبین کو کم از کم اس نفسیاتی الجھن سے بچا لیا جائے جو اس کے قانوناً ناجائز ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہیں حیوانی سطح زندگی پر ایمان کے نتائج و عواقب' اجتماعی اور انفرادی زندگی میں۔ انفرادی زندگی کی یہ مثالیں ہم نے ضمناً پیش کر دی ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر بالخصوص' اس ایمان کے وہ عواقب ہیں جو انسانوں کی بین الاقوامی زندگی کو محیط ہو رہے ہیں۔ یعنی ہر جگہ جنگل کا قانون کارفرما ہے اور حالت اب یہ ہو چکی ہے کہ ؎

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اقبال ہی کے دوسرے الفاظ میں ؎

تہذیب کا کمال' شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

☆☆☆

''جنگل کے قانون'' پر ایمان کے نتائج و عواقب ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ اس کے برعکس' ''مستقل اقدار'' پر ایمان کیا نتائج مرتب کرتا ہے' ہمیں افسوس ہے کہ عصر حاضر سے ہم اس کی عملی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔۔اس لئے کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین بھی ایسا نہیں جس میں ان اقدار پر عمل ہو رہا ہو۔۔اقوام مغرب کا تو ان اقدار پر ایمان ہی نہیں' لیکن جو قوم (یعنی مسلمان) ان پر ایمان رکھنے کی مدعی ہے' اس کا بھی درحقیقت ان پر ایمان نہیں۔۔ ایمان کی پرکھ اعمال سے ہوتی ہے۔ ایمان' انسان کے دلی فیصلہ کا نام ہے۔ جس کی نمود اس کے مطابق عمل (کام کرنے) سے ہوتی ہے۔۔لیکن یہ اقدار کیا نتائج مرتب کر سکتی ہیں' اس کا اندازہ ان اقدار پر غور و تدبر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کا اس حقیقت پر ایمان کہ میری قوت کمزوروں کی حفاظت کے لئے ہے' کس قسم کے نتائج پیدا کر سکتا ہے' اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ اس وقت جنگل کے قانون پر ایمان نے دنیا میں کیفیت یہ پیدا کر رکھی ہے کہ کمزور قومیں تو ڈری اور سہمی ہوئی ہیں ہی' خود طاقتور قومیں بھی ایک دوسرے کی طرف سے بے خطر اور مامون نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب برف

عام پڑ جائے تو بھیڑیئے کسی غار میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کھانے کو کہیں سے کچھ ملتا نہیں تو وہ بیٹھے ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں جونہی کسی کو اونگھ آئی' باقی بھیڑیوں نے اسے دبوچ لیا۔ اس وقت دنیا کی طاقتور اقوام کی بعینہٖ یہی حالت ہو چکی ہے۔ ہر قوم کو دوسری قوم کی طرف سے خطرہ ہے اس لئے کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ چونکہ ان سب کا ایمان جنگل کے قانون پر ہے' اس لئے ہر قوم اسی میں اپنی عافیت سمجھتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرے۔ اس لئے یہ اقوام' حصول قوت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر اور کوشش میں پاگل ہو رہی ہیں۔ لیکن اس دوڑ میں اب ہر قوم تھک چکی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ قومیں تیسری عالمگیر جنگ کے تصور سے گھبراتی ہیں۔ ورنہ جس قسم کے واقعات پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے لئے بہانہ بن گئے تھے' ان سے کہیں زیادہ شدید واقعات اب آئے دن ظہور میں آتے رہتے ہیں لیکن عالمگیر جنگ نہیں چھڑتی۔

اقبالؒ نے پہلی جنگ عظیم کے بعد' اقوام مغرب سے کہا تھا کہ۔

وقت آنست کہ آئینِ دِگر تازہ کُنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کُنیم

''آئین دگر'' سے اس کی مراد یہ تھی کہ ''جنگل کے قانون'' کی جگہ مستقل اقدار انسانیت کو آئینِ حیات قرار دیا جائے۔ اس وقت اس کی کسی نے نہ سنی اور اقوام مغرب اپنی وحشت سامانیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت زیادہ مساعد ہے۔۔ کمزور قومیں بہت زیادہ سہمی ہوئی ہیں اور طاقتور قومیں' باہمی عدم اعتماد کے ہاتھوں تنگ آ چکی ہیں۔۔ اگر اس وقت دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے نظام کو مستقل اقدار پر متشکل کر لے' تو مردم گزیدہ انسان اس کی طرف لپک کر آئے گا۔ اقبال کو کسی ایسی ہی قوم کی تلاش تھی جسے وہ اس طرح دیوانہ وار پکار پکار کر آوازیں دے رہا تھا کہ

اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

جب وہ بندۂ مومن کو یوں پکار پکار کر تھک گیا تو پاکستان کا تصور اس کے افق قلب سے ابھرا۔ اس نے ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا کہ

> اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

اس نے پاکستان کی ''نئی دنیا'' کا تصور' اسی ''نئے آدم'' کی نمود کے لئے دیا تھا لیکن افسوس کہ ہم بھی اقوام مغرب کی نقالی میں' انہی فرسودہ راہوں پر چل نکلے اور اتنا نہ سمجھا کہ ''جنگل کے قانون'' کے مطابق' ہم ان قوموں کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے جو طبعی قوت میں ہم سے کہیں آگے نکل چکی

ہیں۔ لہٰذا' ہمارے لئے چارۂ کار یہ تھا کہ ہم اپنے ہاں' اس بربریت کے قانون کی جگہ' انسانیت ساز اقدار کو فروغ دیتے اور پھر دیکھتے کہ دنیا کی کوئی قوت بھی' ان کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ قرآن نے جب کہا تھا کہ۔۔ ''لیظھرہ' علے الدین کلہ''۔ مستقل اقدار پر مبنی نظام حیات' دنیا کے تمام دیگر نظامہائے زندگی پر غالب آ سکتا ہے تو اس نے یونہی شاعری نہیں کی تھی۔ جب اس نے اعلان کیا تھا کہ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ اگر تم جنگل کے قانون پر ایمان کی جگہ' انسانی اقدار کی صداقت پر ایمان لے آئے' تو تم ساری دنیا پر غالب آ جاؤ گے' تو اس نے (معاذ اللہ) دروغ مصلحت آمیز سے کام نہیں لیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ۔۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علے المومنین سبیلا۔ (۴/۱۴۱) غلط نظریہ زندگی پر ایمان رکھنے والے' ان لوگوں پر کبھی غالب نہیں آ سکتے جو صحیح قانون حیات پر ایمان رکھیں' تو اس نے (معاذ اللہ) اس قوم کو جھوٹی ''ہلاشیری'' نہیں دی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو بیان کیا تھا کہ حیوان کتنی ہی عظیم قوت کا مالک کیوں نہ ہو جائے' ''انسانی قوت'' کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ دنیائے تہذیب وتمدن میں' ''انسانی قوت'' سے مراد ان اقدار کی قوت ہے جن سے انسانیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ ہم نے اس قوت کو کبھی آزمایا نہیں اس لئے ہم اس کی عظمت واہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔۔ اور آزمایا اس لئے نہیں کہ ہمیں اس پر ایمان نہیں۔۔ ایمان تو ایک طرف رہا' جنگل کے قانون کی وجہ سے' ہمارے ہاں بھی عظمت واہمیت کے معیار اس قدر بدل چکے ہیں کہ ہم شاید' ''احترام آدمیت'' کا مفہوم تک سمجھنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ لیکن اس کے باوجود' ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں کوئی خطۂ زمین ان اقدار کی تجربہ گاہ بننے کے قابل ہو سکتا ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔۔ ہماری فضاؤں میں سرسید' اقبال' جناح کے تصورات ابھی تک جگمگا رہے ہیں۔ یہاں جس انداز سے قرآنی فکر عام ہو رہا ہے دنیا میں کسی اور جگہ اس کی مثال نہیں ملتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم نے اس مملکت کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا۔

لیکن اگر ان تمام دلائل و براہین کے باوجود (بدنصیبی سے) ہمیں اس حقیقت پر یقین نہیں آ سکتا' کہ ان اقدار پر عمل کرنے سے ہمیں سرفرازی وسربلندی نصیب ہو سکتی ہے' تو بر سبیل تنزل' اسے آزمائشاً اختیار کر کے ہی دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں' یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے قانون کے مطابق' ہم طبعی قوت میں اقوام غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم ایک متبادل طریق علاج کے طور پر' ان اقدار پر عمل کر کے دیکھ لیں۔ اگر (بفرض محال) یہ طریق' مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکا تو اس سے ہمارا نقصان بہرحال کچھ نہیں ہو گا۔ یہ اقدار' طبعی قوت کے حصول' استحکام اور بقاء کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں یہ اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ (فرق صرف اس کے محل استعمال میں ہوتا ہے) لہٰذا' انہیں آزمائشی طور پر اختیار کرنے سے بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔

اس کے برعکس، اگر یہ کامیاب ثابت ہوگئیں (اور ان کے کامیاب ہونے میں کلام ہی کیا ہے) تو یہ ہمیں اس مقام پر پہنچا دیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا اور اس کے ساتھ ہی یہ عالمگیر انسانیت کو بھی اس جہنم سے نجات دینے کا موجب بن جائیں گی جس میں وہ اس وقت گرفتار ہے اور جس سے نکلنے کی اسے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ یاد رکھئے! جب تک ہم اپنے موجودہ (Pattern) کو نہیں بدلتے، ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ معاشی دنیا میں ہم، اپنے موجودہ معاشی نظام کی رو سے، سرمایہ دار قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمیشہ ان کا دست نگر رہنا پڑے گا اور عمرانی دنیا میں ہم ''جنگل کے قانون'' کی بنا پر بالا دست اقوام مغرب کو چھو تک نہیں سکتے۔ ہم زندہ اور پائندہ رہ سکتے ہیں تو صرف اپنے نظام کی تبدیلی سے اور یہ تبدیلی مستقل اقدار خداوندی کی بنیادوں پر ہی عمل میں آ سکتی ہے۔ اس تبدیلی سے جو محیرالعقول قوت حاصل ہوتی ہے اسے سمجھانے کے لئے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح، شیر اور ہاتھی کی بے پناہ قوت، ایک انسانی بچے کی ذہنی فراست کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اسی طرح جنگل کے قانون پر ایمان رکھنے والی قوموں کی مجموعی طاقت بھی اس نظام کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو انسانیت ساز اقدار پر متشکل ہوا ہو۔

یقین پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ

احترام

مسٹر اے۔ کے بروہی کا ایک مقالہ' بہ عنوان احترام (Reverence) معاصر ڈان میں شائع ہوا جس میں انہوں نے کارلائل اور گوئٹے وغیرہ کی اسناد' اور سقراط کی مثال سے بتایا کہ نوجوانوں کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ وہ اپنے اندر احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ بغاوت اور سرکشی کوئی قابل قدر جذبہ نہیں۔ تعلیم و تربیت کا ماحصل' تعظیم و تکریم اور احترام و سپردگی کے جذبات ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ ہمارے زمانے میں تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے طالب علموں کے دل میں احترام و تعظیم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے وہ سرکشی اور بغاوت میں فخر محسوس کرتے ہیں اور یہ مسلک ہمارے معاشرہ کے لئے بڑا خطرناک ہے اگر اس کی جلد اصلاح نہ کی گئی تو اس کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔

ہم مسٹر بروہی سے حرفاً حرفاً متفق ہیں کہ احترام و تعظیم کے جذبات' شرف انسانیت کے آئینہ دار ہیں اور جس معاشرہ کے نوجوانوں کے دل ان جذبات عالیہ سے عاری ہوں گے وہ معاشرہ کبھی مہذب و متمدن نہیں کہلا سکے گا۔ ہم اس سے بھی متفق ہیں کہ خود معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہے کہ افراد معاشرہ کے دل میں احترام و تکریم کے جذبات موجزن رہیں۔ بغاوت اور سرکشی کی بنیادوں پر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ہماری قوم کے نوجوانوں کے دل سے احترام و تعظیم کے جذبات اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں جن کے مظاہرے آئے دن ہمارے اجتماعات میں ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احترام کس کا کیا جائے؟ تعظیم کا مستحق کون ہے؟ جذباتِ سپردگی کی عقیدت کس کی بارگاہ میں پیش کی جائے؟ کس شخص کو واجب التکریم اور کون سے حکم کو واجب التعمیل سمجھا جائے؟ اس ضمن میں مسٹر بروہی فرماتے ہیں کہ

> ماں باپ کے حکم کا احترام' استاد کے حکم کا احترام' معاشرہ کے احکام کا احترام جو اس کی اقدار و روایات وقوانین کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

ہمیں اس سے اختلاف ہے کہ ماں باپ' استاد' اسلاف کا ہر حکم (بلا مشروط) واجب الاحترام ہے' اور معاشرہ کی تمام اقدار و روایات اور ضوابط بلا استثناء واجب التعمیل۔ اگر

بروہی صاحب کے نزدیک اسی کا نام جذبات احترام وتکریم ہے تو ان جذبات سے دنیا کی کوئی قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس سے انسانیت کا ارتقاء رک جاتا ہے اور شرف آدمیت پر جمود وخمود طاری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں کو یہ سبق دیا جائے کہ جو کچھ ماں باپ اور اساتذہ کہیں اسے بلا چون و چرا تسلیم کئے جاؤ۔ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اسے کبھی تنقیدی نگاہ سے نہ پرکھو۔ اپنے معاشرہ کی روایات وضوابط کی شدت سے پابندی کرو اور ان کا کبھی جائزہ نہ لو۔ تو اس قوم میں کبھی ایسے انسان پیدا نہیں ہوں گے جو اپنی ذہنی بالیدگی سے قوم کی سطح کو بلند کر سکیں۔ اور کاروان انسانیت کو ایک قدم بھی آگے لے جا سکیں۔ یہ وہی کورانہ تقلید ہو گی جس کا نتیجہ انسان کو حیوان بنا دینا ہوتا ہے (بلکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق حیوان سے بھی بدتر۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل)۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادی النظر میں اس قسم کی تعلیم بڑی خوش آئند دکھائی دیتی ہے کہ ہر ایک کی تعظیم کرو۔ جو اپنے سے بڑا ہو اس کا حکم مانو۔ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ استاد کی فرمانبرداری کرو۔ اسلاف کے طریقے سے ایک قدم ادھر ادھر نہ ہٹو۔ اپنے معاشرہ کی روایات کا احترام کرو اور اس کے ضوابط کی تعمیل لیکن اگر بہ نگاہ تعمق دیکھا جائے تو یہ تمام حسین وجمیل جذبات' پیدا کردہ ہیں اس دور استبداد کے جس میں سکھایا یہ جاتا تھا کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں *

اور پڑھایا یہ جاتا تھا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست * *

یہی وہ ''اخلاقی ضوابط'' تھے جن کی رو سے ہر ''بڑے'' کا حکم واجب التعمیل قرار پا جاتا تھا۔ اس تعلیم کا آغاز ''ماں باپ کی اطاعت'' سے ہوتا تھا۔ اس سے آگے استاد کی اطاعت تھی۔ یہ استاد' پاٹھ شالاؤں میں برہمن اور مسجدوں اور مکتبوں میں ملا ہوتے تھے۔ انہی سے پیشوائیت (Priesthood) کی اطاعت مسلم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اسلاف کی اطاعت جو مردوں کی پرستش (Ancestoral Worship) پر منتج ہوتی تھی اور اس سیڑھی کے ذریعے' آخرالامر بادشاہ کی اطاعت' جو ایشور کا اوتار یا ظل اللہ (خدا کا سایہ) بن جاتا تھا۔ ''بزرگوں کی تعظیم'' اور ''روایات کے احترام'' کے ہی وہ جذبات ہیں جنہیں (Robert Briffault) رابرٹ برفا' (Custom Thought) اور (Power Thought) کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ

> اس سے عقل وشعور کے صرافے میں جعلی سکوں کی بھرمار ہو جاتی ہے اور انسان ان افکار کی رو سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن پر جعلی اقدار کی مہریں ثبت کر دی جاتی ہیں اور اس طرح وہ ہر شے کو رنگین چشمے سے دیکھتا ہے۔ ***

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' یہ ''اخلاقی ضوابط'' بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں (جس طرح سینٹ پال کی یہ غلامانہ تعلیم کہ ''دشمن سے بھی پیار کرو'' اور ''ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دو'')۔ لیکن قرآن اس قسم کے غلط

*اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو اس کے جواب میں کہنا چاہئے کہ ہاں حضور! وہ دیکھئے آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے ہیں۔ **بزرگوں کی غلطی پکڑنی بہت بڑا جرم ہے۔
***The Making of Humanity, p-83

جذبات کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ حقائق کو بے نقاب پیش کر دیتا ہے خواہ انہیں (Face) کرنا بعض طبائع پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گذرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ واجب الاحترام صرف وہ حکم ہے جو حق پر مبنی ہے اور واجب التکریم وہ ہستی جو حق کا حکم دیتی ہے۔ جو حق کا حکم نہیں دیتا وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں خواہ وہ باپ ہو یا استاد۔ اسلاف ہوں یا اخلاف۔ معاشرہ ہو یا حاکم۔ روایات ہوں یا ''مسلمات''۔ نہ صرف یہ کہ ایسا فیصلہ واجب الاحترام نہیں بلکہ اس کی مخالفت فرض ہے۔ قرآن کریم نے قصۂ حضرت ابراہیمؑ میں اس حقیقت کے مختلف گوشوں کو نہایت واضح انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے۔ بیٹے کی نگۂ حقیقت شناس، باپ کی اس روش میں کھلی ہوئی گمراہی دیکھتی ہے۔ وہ باپ سے برملا کہتے ہیں کہ

> یابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا (۱۹/۴۱)۔
>
> اے میرے باپ! تو ان پتھروں کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتے ہیں۔

ایسا کہنے میں نہ تو باپ کا احترام ان کے عناں گیر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے معبودوں کی تعظیم دامن کش۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے خطاب کرتے ہیں کہ

> ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون (۲۱/۵۱)
>
> یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ رہے ہو؟

''بزرگوں کا احترام'' یہاں بھی (حضرت) ابراہیمؑ کے گلوگیر نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں قوم، اسلاف کی تعظیم کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ اور ابراہیمؑ سے کہتی ہے کہ

> قالوا وجدنا اٰباء نا لھا عبدین (۲۱/۵۲)
>
> ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔

انہی کی اتباع میں ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسلاف کا احترام، بزرگوں کی عظمت، معاشرہ کی روایات کا یہی تقاضا ہے کہ ہم وہی کچھ کریں جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے خلاف دل میں خیال تک لانا بھی جرم ہے غور کیجئے! قوم کے بڑے بوڑھوں نے کس طرح اسلاف کی عظمت اور روایات کے احترام کو بطور دلیل پیش کیا ہے؟ لیکن حضرت ابراہیمؑ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ کیا وہ ''بڑوں کے احترام'' اور معاشرہ کی روایات کی تعظیم سے مرعوب ہو گئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے کہا کہ

> لقد کنتم انتم واٰباء کم فی ضلٰل مبین (۲۱/۵۴)
>
> یقین کرو۔ تم خود بھی اور تمہارے اسلاف بھی صریح گمراہی میں رہے۔

یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ تم معاشرہ کی روایات اور اسلاف کی روش کو بطور دلیل پیش کرتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ افرأیتم ماکنتم تعبدون۔ انتم واباء

کم الا قدمون (۲۶/۷۵) کیا تم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ تم اور تمہارے اسلاف جس روش کے پابند ہو اس کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس مقام پر کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی کہ وہ اسلاف سے چلی آتی ہے۔ نہ ہی کوئی دلیل اس لئے دلیلِ محکم بن سکتی ہے کہ اسے متقدمین کی سند حاصل ہے۔ تمہیں خود غور کرنا چاہئے کہ اسلاف کی جو روش ہم تک منتقل ہو کر آئی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو اسے جاری رکھو اور اگر غلط ہے تو اسے فوراً ترک کر دو۔ یہ ہے صحیح مسلک۔

باپ اور جمہور سے آگے بڑھ کر' حضرت ابراہیمؑ معبد کے پوجاریوں تک پہنچے۔ یہی لوگ اس زمانے میں استاذ' مرشد اور ''خدا کے نمائندے'' ہوتے تھے۔ (اور آج بھی ان کی یہی پوزیشن ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی تفصیل قرآن کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اس نوجوان کی اس ''بغاوت وسرکشی'' کی بنا پر فیصلہ کیا کہ

قالوا احرقوہ وانصروا اٰلھتکم ان کنتم فعلین (۲۱/۶۸)

انہوں نے آپس میں کہا کہ اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس نوجوان کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

یہاں تک' باپ' قوم کے عام بڑے بوڑھے' اسلاف' معاشرہ کی روایات حتیٰ کہ اساتذہ' علماء' مرشدانِ طریقت' سب آ گئے۔ لیکن ابھی اس سلسلۂ استبداد کی آخری کڑی باقی ہے یعنی بادشاہ۔ حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور حق گوئی نے اس کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ (فبھت الذی کفر ۳/۲۵۸)۔

یہ ہے وہ روشِ ابراہیمیؑ جس کے متعلق قرآن نے ہم سے کہا ہے کہ

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ (۶۰/۴)۔

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء (کی روش) ایک عمدہ نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس روش کو قرآن نے ''اسوۃ حسنہ'' قرار دیا ہے' وہ روش یہ نہیں کہ ماں باپ' اساتذہ' مذہبی راہنماؤں' اسلاف' معاشرہ کی روایات اور ارباب اقتدار کے ہر حکم کا احترام اور ہر فرمان کی تعمیل کرتے جاؤ۔ ''اسوۃ حسنہ'' یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو' وہ کہیں بھی ہو اور کسی کی طرف سے بھی ہو' اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ' قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی روشِ حیات کو بطور ''اسوۃ حسنہ'' پیش کیا ہے۔ (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ)۔ حضورؐ کی روشِ کیا تھی؟ آپؐ کی پیدائش بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ایسے ہی معاشرہ میں ہوئی جہاں ہر طرف گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے اس مروجہ مسلک کی مخالفت اس شدت سے کی کہ قوم کے بڑے بوڑھے' کعبے

کے متولی' تمام بزرگ' اکٹھے ہو کر آپ کے چچا* کے پاس آئے کہ اس نوجوان کو ان حرکات سے روکا جائے۔ خود چچا نے بھی ان کی ہمنوائی میں آپ سے کہا کہ بزرگوں کا احترام اور اسلاف کی تعظیم بڑی ضروری ہے اس لئے آپ ان کی مخالفت سے باز آ جائیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بھی وہی کچھ کہا جو حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ''اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیا جائے تو میں پھر بھی غلط بات کی مخالفت سے باز نہیں آؤں گا۔'' اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ میدان جنگ میں ایک طرف نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھی تھے اور دوسری طرف حضورؐ کے یہی بزرگ (چچے وغیرہ) اور ان کی اولاد۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی ایک مسلسل جہاد تھی اپنے معاشرہ کے مسلمات کے خلاف۔ ایک انقلاب آفریں دعوت تھی ان روایات کے خلاف جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آ رہی تھیں اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ ہی پر موقوف نہیں' بلکہ تمام انبیاء کرام کا مشن ان روایات وتصورات کے خلاف مسلسل پیکار تھا جو اس معاشرہ میں عام ہوتے تھے جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے۔ اس میں نہ کسی زندہ کا احترام ان کی راہ میں حائل ہوتا تھا نہ مردہ کا تقدس۔ یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم اور حضرات انبیاء کرام ﷺ کا اسوہ۔

ہم نے کہا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو اس کی مخالفت عین فریضۂ زندگی ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حق کسے کہتے ہیں مسٹر بروہی نے گوئٹے کا جو اقتباس دیا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ

احترام کیا جائے ان کا جو ہم سے بڑے (Greater) اور بہتر (Better) ہیں۔

اور خود ہی بروہی صاحب نے لکھا ہے کہ

زندگی میں جو کچھ بھلا (Good) اور بڑا (Great) ہے اس کا احترام کیا جائے۔ ''بھلا اور بڑا'' (Good and Great) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم متعین نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان الفاظ کا مفہوم متعین نہ ہو' ان کا واضح تصور سامنے نہیں آ سکتا۔ فلسفہ اور اخلاقیات آج تک خیر و شر (Good and Evil) کے متعلق کوئی حرف آخر نہیں کہہ سکے۔ اس لئے ایسے الفاظ کو احترام اور عدم احترام کا معیار قرار دینا' قوم کو نظری بحث سے آگے نہیں لے جا سکتا۔ ہمارا تخاطب مسلمانوں سے ہے (اور ظاہر ہے کہ بروہی صاحب کے مخاطب بھی اسی قوم کے نوجوان ہیں) اور مسلمانوں کے لئے خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز بالکل واضح ہے۔ حق وہ ہے جس کا حکم قرآن دیتا ہے اور باطل وہ جس سے وہ روکتا ہے۔ لہٰذا' ایک مسلمان کے لئے احترام صرف قرآنی احکام کا ہے اور اسی بنا پر' ان گوشوں کا جہاں سے قرآنی احکام صادر ہوں۔ ماں باپ ہوں یا استاذ' اسلاف ہوں یا اخلاف' بزرگ ہوں یا خورد' معاشرہ ہو یا حکومت۔ احترام صرف اس کا ہے جو قرآن کے مطابق حکم دے۔ جو اس کے خلاف حکم دے اس کی مخالفت ایک مسلم کا فریضۂ زندگی ہے اور اتباع اسوۂ رسولؐ اللہ۔

لہٰذا صحیح مسلک یہ ہے کہ

ماں باپ' اساتذہ' اسلاف کی روایات' معاشرہ

* حضورؐ کے والد تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے۔ یہی چچا منزلہ والد کے تھے۔

کے ضوابط وقوانین کا احترام نہایت' ضروری ہے بشرطیکہ وہ حق' یعنی قرآن کے مطابق ہوں۔

یہی وہ تعلیم ہے جس سے ذہنوں میں جلاء' قلوب میں پاکیزگی' فکر میں بلندی' معاشرہ میں ہمواری' انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسنِ توازن اور انسانیت میں ارتقاء پیدا ہوگا۔ یہی چیزیں اس احترام وتعظیم کا موجب بنتی ہیں جس کی سوتیں دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں۔ احترام کے جذبات دل کے چشموں سے ابھر کر باہر نکلتے ہیں۔ انہیں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا۔ احترام پیدا ہوتا ہے عظمت کے احساس سے۔ آپ قوم کے نوجوانوں کو قرآن کی تعلیم دیجئے۔ جب قرآن کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہو گی تو ان کی نگہٗ عقیدت خود بخود قرآن کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ آپ اپنے ہاں قرآنی معاشرہ پیدا کیجئے۔ جب اس کے درخشندہ نتائج قوم کے سامنے آئیں گے تو اس معاشرہ کی تعظیم وتکریم کے جذبات خود بخود قوم کے دل سے ابھریں گے۔ آپ ان نوجوانوں کے سامنے ایسے افراد پیش کیجئے جو قرآنی سیرت کے پیکر ہوں پھر دیکھئے کہ انہی نوجوانوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے یا نہیں کہ

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

آپ ان نوجوانوں کو تعلیم تو یہ دیتے ہیں کہ

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو گرگٹ نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء' ص ۱۱۵)۔

اور ان سے پھر توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اس قسم کے مذہب اور روایات کا احترام کریں؟ آپ ان کے سامنے معاشرہ ایسا پیش کرتے ہیں جس کے متعلق افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اسے ''چار سو بیس'' سے تعبیر کر کے بھی مطمئن نہیں ہوتے کہ ان الفاظ نے ان کے جذبات کا کما حقہ اظہار کر دیا ہے اور اس کے بعد ان نوجوانوں سے اس معاشرہ اور اس کے لزوم وتضمنات کی تعظیم چاہتے ہیں؟ آپ ان کے سامنے افراد ایسے پیش کرتے ہیں جن کے تصور سے انسان کو ہنسی آ جائے اور ان نوجوانوں کو کہنیاں مار مار کر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں سعادت مآب کہہ کر پکاریں۔ احترام' اعترافِ عظمت کا نام ہے۔ جہاں عظمت نہ ہو وہاں احترام کس طرح پیدا ہو جائے۔ احترام از خود پیدا ہوتا ہے' پیدا کیا نہیں جا سکتا۔

حقیقت خود کو منواتی ہے' منوائی نہیں جاتی

جو افراد' زمانے سے اپنا احترام کراتے ہیں ان کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ سارے زمانے سے لڑائی مول لیتے ہیں۔ مخالفین کا ہجوم ان سے پوچھتا ہے کہ تمہاری صداقت کی دلیل کیا ہے۔ وہ انہی مخالفین سے کہتے ہیں کہ

قد لبثت فیکم عمراً من قبله افلا تعقلون۔

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

وہ یہ کہتے ہیں اور مخالفین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں اٹھتا جو کہنے والے کے کیریکٹر کے متعلق ایک حرف بھی مخالفت میں کہہ سکے۔ یہی نہیں کہ ان کے سامنے ایسا نہ کہہ سکے۔

بلکہ یہ کہ اہل مکہ نے ابوسفیان کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے مدد مانگے تا کہ اس تحریک (نبی اکرمؐ کی دعوت) کا خاتمہ کیا جائے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ اس داعئ انقلابؐ کے کیریکٹر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ جھوٹ بولتا ہے؟ کیریکٹر کے احترام کی یہ کیفیت ہے کہ ابوسفیان نے وہاں بھی اعتراف کیا کہ اس داعئ انقلاب نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی بددیانتی نہیں کی۔ نگاہوں کے سجدے وقف ہوتے ہیں ان افراد کے لئے۔ نہ ان کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

احترام ہوتا ہے اس معاشرے کا جس کی حالت یہ ہو کہ جب ایک نومسلم اپنے ٹیکس کا روپیہ خزانے میں داخل کرنے کے لئے لایا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس نئے (اسلامی) معاشرہ نے تمہارے لئے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی تک تو اس کا موقع نہیں آیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تم اپنا روپیہ واپس لے جاؤ۔ جب تک کوئی معاشرہ فرد کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا اسے حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس فرد کی کمائی سے کچھ لے۔ اس معاشرے کا احترام کس طرح ہوسکتا ہے جس کا عالم یہ ہو کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل برد

معاشرہ تو ایک طرف اس باپ کا احترام اولاد کے دل میں نہیں رہتا جو خود تو مرغ اڑائے اور بچے بھوکے مریں۔

☆☆☆

ہمارے نوجوانوں میں البتہ ایک بات ایسی پیدا ہورہی ہے جو بڑی معیوب ہے اور جسے کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اور وہ ہے بدتمیزی۔ ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا نوجوان طبقہ بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بدتمیزی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ وہی قرآن جو حریم کعبہ سے بتوں کو باہر نکال دینے کا حکم دیتا ہے اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ان بتوں کو یا مشرکین کے دیگر معبودان باطل کو گالی دی جائے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (۶/۱۰۹)۔

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو گالیاں مت دو۔ کہ پھر وہ بھی حد سے تجاوز کر کے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بدتمیزی پر اتر آنا اپنی کمزوری کا اعتراف اور شکست کا اظہار ہے، اور وہ بھی بڑی کم ظرفی اور کمینگی کے ساتھ۔ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کیجئے۔ لیکن بدتمیزی پر کبھی نہ اتریئے۔ تقدیر امم کے مطالعہ سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جس قوم میں قوت باقی نہیں رہتی اس کا عمر رسیدہ طبقہ شکوہ سنجی اور مرثیہ خوانی شروع کر دیتا ہے اور اس کا نوجوان طبقہ بدتمیزی پر اتر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور اسی صورت حالات کا احساس ہے جو سنجیدہ طبقے کو یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد حسین رزاقی

اِصلاحِ عقائد کے لئے سرسیّد کی کوششیں

سرسید کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ صدیوں کے دوران میں وہ رفتہ رفتہ صحیح اسلامی تعلیمات اور اس کے اصول و مقاصد سے دور ہو گئے تھے اور غیر محسوس طریقہ پر اس ملک کی غیر مسلم قوموں کے ایسے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اختیار کر لئے تھے۔ جو درحقیقت اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کے اس غلط طرز عمل اور ملک کے بدلے ہوئے حالات نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے شدید خطرات اور اہم مسائل پیدا کر دیئے تھے اور اسلام کے فروغ و استحکام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ان کے عقائد و نظریات کو درست کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ سرسید نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی اصلاحی تحریک میں دینی عقائد کی درستی کو بنیادی اہمیت دی۔ سرسید کو اس بات کا رنج تھا کہ مسلمان غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی تصور کر کے ان پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی دینی و معاشری حالت بگڑ گئی ہے اور دوسری طرف اسلام کی بدنامی ہوتی ہے کیونکہ لوگ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اسلام کے متعلق غلط رائے قائم کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس غلط خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کی دینی و معاشری حالت کو بہتر بنانے کے لئے سرسید نے مسلمانوں کے عقائد و نظریات درست کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور اس مقصد کے لئے موثر جدوجہد شروع کر دی۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان پر عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور ان کے تبلیغی ادارے جن کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی، مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے اسلام پر طرح طرح کے الزام عائد کرتے تھے۔ لیکن مسلمان اپنے مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کی موثر تردید نہ کر سکتے تھے اور عیسائی پروپیگنڈے سے ان کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اسلام کے دشمنوں نے عیسائیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسلام، انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا مخالف اور خون آشام مذہب ہے۔ اس لئے عیسائی

مسلمانوں کو بہت خطرناک تصور کرتے تھے اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ ان کو اپنا شدید مخالف سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نے ان کے اس اندیشہ کو درست ثابت کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو موقع مل گیا تو وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس لئے انگریزوں کی پالیسی مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت پر مبنی تھی۔ اورانہوں نے جوطریقہ تعلیم نافذ کیا وہ مسلمانوں کے دینی عقائد میں شکوک وشبہات اورانتشار پیدا کرنے والا تھا چونکہ مسلمان اسلام سے صحیح طور پر واقف نہ تھے اور نئے نظام تعلیم میں ان کی مذہبی تعلیم وتربیت کا انتظام نہ تھا۔ اس لئے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام سے بدگمانی پیدا ہو جانے کا قوی امکان تھا اور بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لئے جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ یہ وہ بڑے خطرات تھے جن پر غالب آنا ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے بہت ضروری تھا اور سرسید نے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے دینی عقائد کی اصلاح کے لئے اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کیا۔ عیسائیوں کے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ انگریزی حکومت کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور جدید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم وتربیت دینے کے منصوبہ کو بڑی خوبی اور کامیابی سے عملی شکل دی۔

مذہب کی سچائی اور فضیلت کا معیار

عقائد ونظریات کو درست کرنے کے لئے سرسید نے یہ کوشش کی کہ اسلام کا صحیح تصور مسلمانوں کے ذہن میں بیٹھ جائے اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ محض عبادات اور رسوم ورواج کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے والا دین ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسان کی پوری زندگی کو سنوارنا اورنکھارنا ہے۔ اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے تمام اصول فطرت انسانی * کے مطابق ہیں اوراس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جوانسان کے مرتبہ کے منافی ہو یا جس پر عمل کرنا اس کے امکانات سے باہر ہو۔ اسلام کے بارے میں سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ''کوئی مذہب ایسا دنیا میں نہیں ہے جو دوسرے مذہب پر گو وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو اپنی ترجیح بہ ہمہ وجوہ ثابت کر دے مگر یہ رتبہ صرف اسی مذہب کو حاصل ہے جو نیچر * کے مطابق ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ صرف ایک مذہب ہے جس کو میں ٹھیٹھ اسلام کہتا ہوں اور جو بدعات محدثات سے اور غلط خیال اجماع سے اور خطائے اجتہادات سے اور ڈھکوسلۂ قیاسات سے اور شکنجۂ اصول فقہ مخترعہ سے مبرا و پاک ہے۔'' مذہب کی سچائی اور برتری کا معیار سرسید نے یہ قرار دیا کہ اس میں کوئی بات قانون فطرت کے برخلاف نہ ہو کیونکہ قانون فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو

---

* حاشیہ مضمون کے آخر میں دیکھئے۔ طلوع اسلام۔

مذہب واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونا ضروری ہے۔ مذہب کو جانچنے کے اسی معیار کے مطابق انہوں نے اسلام کی سچائی اور فضیلت کو تسلیم کیا اور ۱۸۸۴ء میں لاہور میں اسلام پر تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام فطری دین ہے اور اس کے اصول فطرت کے مطابق ہیں منطق و فلسفہ اور علم طبعی میں کتنی کچھ تبدیلی کیوں نہ ہو اور ان کے مسائل اسلام کے مخالف ہی کیوں نہ معلوم ہوں اسلام ہی برحق اور سچا ہے۔ اسلام فطرت انسانی کے مطابق ہے اور یہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔ اسلام کے مسائل دو قسم کے ہیں منصوصی اور اجتہادی۔ خدا اور خدا کی وحدانیت پر ایمان اور تصدیق نبوت اسلام کے دو بنیادی رکن ہیں اور اسلامی احکام کا وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عنداللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخرالزماںؐ کے دل میں القا ہوا ہے اس طرح بے کم و کاست نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی پوری طرح تعمیل کرنا لازمی ہے اور یہ حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے لیکن اجتہادی مسائل صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی اور ان میں جو غلط ہوں ان کی اصلاح کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے کیونکہ اجتہادی مسئلہ مجتہد کا خیال ہے جو خطا سے معصوم نہیں۔ چنانچہ اجتہادی مسائل اگر فطرت انسانی کے برخلاف ہوں تو اس سے اسلام پر حرف نہیں آتا اور اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں آتا۔

دین و دنیا میں تفریق کا غلط رجحان

اسلام نے دین اور دنیا میں تفریق کرنے کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کی ہے اور دونوں کی بہتری کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن اسلامی اثرات کے تحت مسلمانوں میں دین اور دنیا میں تفریق کرنے کا رجحان پیدا ہوگیا۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں کی اصلاح میں یہ خیال ایک بڑی رکاوٹ تھا کہ اصل چیز تو صرف اخروی ہے۔ دنیاوی نعمتیں حاصل کرنے کی خواہش بڑی گمراہی ہے۔ اس عقیدے نے مسلمانوں میں اس قدر غلط احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی تباہ حال زندگی کو سنوارنے اور ترقی کرنے کے خیال سے غافل ہو گئے تھے۔ اس رجحان کو ختم کر کے لوگوں کو اپنی حالت کو بہتر بنانے پر متوجہ کرنے کے لئے سرسید نے ان کو یہ بتلایا کہ نجات ابدی جو ہر سچے مذہب یا سچے دین کا نتیجہ ہے وہ دنیا کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے تمام عمر عسرت و تنگی میں بسر کی ہو سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے اور جس نے لاکھوں، کروڑوں روپے جائز طور پر پیدا اور صرف کئے ہوں وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجات ابدی پا سکتا ہے دنیا اور دین میں ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔

فرض کرو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے سب مفلس اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوں اور در بدر بھیک مانگتے پھریں۔ اور ان کی اولاد جاہل اور نالائق' چور اور بدمعاش ہو تو اس وقت ان کے دین کا کیا حال ہو گا۔ پیٹ ایک ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے۔ خدا ملے یا نہ ملے اس کو بہرحال بھرنا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں۔ کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہیں یا کسی کا گھوڑا مل رہے ہیں لیکن جو ایسے پکے دیندار نہیں ہیں وہ کیا کریں گے معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور نوآباد جزائر بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسیا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہو گی۔ اگر مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہو جائے کہ واعظین کو جو محض ریا کاری اور مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں۔ کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمۂ تر کھلانے والا نہ رہے' جناب حضرت پیر جی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کے اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدر اوشمس بازغہ پڑھاتے ہیں ان کو کوئی چار پیسے کا نوکر رکھنے والا نہ رہے اسوقت ان سب کو یہ پتہ چلے گا کہ مسلمانوں میں دنیاوی ترقی و تہذیب اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا اور امر معاش میں منہمک ہونا امر معاد سے غفلت برتنا ہے یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سرتا سر معاد کا ہے۔

سرسید کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی دنیاوی حالت اچھی ہو گی تو اس سے ان کے دین کی بھی عزت اور توقیر بڑھے گی اور اگر وہ دنیاوی اعتبار سے ذلیل و خوار ہوں گے تو ان کی اس حالت سے ان کے دین پر بھی برا اثر پڑے گا۔ چنانچہ ایسی حالت میں جب کہ مسلمان معاشی تباہی' معاشری بدحالی اور علم سے محرومی کے باعث روز بروز پست سے پست تر ہوتے جا رہے تھے اور ذلیل و حقیر سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو' علوم دینی قائم رہیں۔ علوم دنیاوی قائم رہیں۔ علوم دنیاوی جو مفید و کارآمد ہیں انکا رواج اور ترقی ہو۔ لوگ معاش سے فارغ البال ہوں اکل حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں۔ حسن معاشرت میں جو نقص ہوں وہ رفع ہوں۔ جن بری رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں مسلمانوں کو' اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں۔ وہ موقوف کی جاویں جو خلاف شرع تعصّبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دور کئے جاویں۔ سرسید کے نزدیک محض دنیا پرستی نہ تھی بلکہ عین دینداری بھی تھی۔

عبادت کا مفہوم

عبادت کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط تصور قائم ہو گیا تھا سرسید نے اس کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ لوگ اس چیز کو بھول گئے تھے کہ ایک فطری دین اس چیز کو پسند نہیں کر سکتا کہ عبادت قانون فطرت کے خلاف ہو۔ اور

انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرے جو فطرت نے اس پر عائد کئے ہیں۔ عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف لوگوں کا خیال یہ تھا کہ تمام رات نماز پڑھنا ہمیشہ دن کو روزہ رکھنا یا کبھی شادی نہ کرنا قابل تعریف عبادت ہے۔ لیکن عبادت کا یہ ایسا تصور ہے جس کو خود حضور رسالت مآبؐ نے غلط قرار دیا ہے۔ سرسید نے حضورؐ کے اس خیال کو سند قرار دے کر مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ ''اصلی اور سچی عبادت وہی ہے جو قانون قدرت کے اصول کے مطابق ہو اور تمام نیکیاں اور عبادتیں جو قانون قدرت کے برخلاف ہوتی ہیں پوری نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہوتیں۔ تمام قویٰ جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کئے ہیں وہ اس لئے پیدا نہیں کئے کہ وہ بیکار کر دیئے جائیں بلکہ اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ سب کام میں لائے جائیں۔ اسلام نے ان قوائے کے کام میں لانے کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس سے جملہ قوائے اعتدال پر اور شگفتہ و شاداب رہیں اور ایک کے غلبہ سے دوسرا بیکار اور پژمردہ نہ ہو جائے مگر بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں اور اس طریقہ کو جس کو ہمارے پیغمبر خدا صلعم نے رہبانیت قرار دیا ہے اور جس کو ہندی زبان میں جوگ کہتے ہیں' کمال عبادت اور انتہائے زہد و تقویٰ قرار دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے مسلمانوں نے سوائے فرائض کے باقی عبادتوں کو صرف نماز' روزہ و تلاوت قرآن مجید اور خیالی ترک دنیا اور درس و تدریس علوم دینیہ اور اوراد و ماثورہ یا وظائفِ مقررۂ پیران ہی میں منحصر کر رکھا ہے حالانکہ انہیں پر ان کا انحصار محض غلط ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض ایسے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جو قانون قدرت کے برخلاف ہیں اور اس لئے مقصود شارعؑ نہیں ہیں''۔

زہد و ریاضت

مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے کے لئے سرسید نے اس خیال کو غلط قرار دیا جو زہد و ریاضت کے بارے میں عام طور پر پایا جاتا تھا اور اس بات پر بہت زور دیا کہ جو نیک کام ذکر و اشغال سے زیادہ مفید ہیں وہ بھی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو مناسب اہمیت نہ دینا بڑی غلطی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایک بڑی غلطی جس میں مسلمان پڑے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل کرنے اور نفل پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے پر منحصر سمجھا ہے۔ زہد و ریاضت جہاں تک کہ حد شرعی سے تجاوز نہ کرے بلاشبہ نیکی و عبادت ہے۔ مگر عام فلاح پر کوشش کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کے دینی اور دنیوی حال اور مال کی بھلائی و بہتری کے ہوں اس سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے اور اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھڑی میں بیٹھ کر کھانا کھاوے اور صرف اپنا پیٹ بھر لے۔ لیکن عام فلاح چاہنے والا جو اس کام میں زہد و ریاضت کرتا ہے اس کی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھلا کر کھاتا ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی ہے کہ تن پروری کو تو عبادت سمجھا جائے اور اصلی فیاضی اور

سخاوت اور ہمدردی کو عبادت نہ سمجھا جائے۔

سرسید کے نزدیک حالات کے بدلنے سے عبادت اور ثواب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ کسی مقام میں اگر پانی کا قحط ہو تو اس جگہ بیٹھ کر نفل پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے یا ذکر و شغل کی ضرب لگانے سے زیادہ ثواب کا کام یہ ہے کہ کندھے پر مشک لاد کر لوگوں کو پانی پلایا جائے۔ اسلئے ایک ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہوگئی ہو ان کی فلاح و ترقی اور بہتری کے لئے کوشش کرنا نفلیں پڑھنے اور رات کو جاگ کر ریاضت کرنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔

ترکِ دنیا

مسلمانوں کے جو غلط رجحانات ان کے زوال کا باعث بنے اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے جن کو ختم کرنا سرسید نے ضروری سمجھا۔ ان میں ترک دنیا کو عبادت تصور کرنے کا غیر اسلامی عقیدہ بھی شامل تھا۔ اسلام اس کی اجازت تو ہرگز نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کا بندہ اور دنیاوی لذتوں اور خواہشوں کا غلام بنجائے لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دنیاوی نعمتیں پیدا کی ہیں انسان ان سے مناسب طور پر فائدہ اٹھائے اور ان کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے استعمال کرے۔ لیکن مسلمان جب اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہونے لگے تو انہوں نے راہبوں اور جوگیوں کا اثر قبول کر لیا اور ترک دنیا کو عبادت خیال کرنے لگے۔ ان کی یہ مفروضہ دینداری درحقیقت دین اور اس کے معاشری مقاصد کے خلاف تھی اور سرسید نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ خیال کہ ترک دنیا عبادت ہے ایک ایسا غلط اور جھوٹا قول ہے کہ اس سے زیادہ دوسرا نہیں ہوسکتا۔ دنیا ہمارے لئے پیدا ہوئی ہے اور ہم دنیا کے لئے۔ پھر ہم اس کو اس طرح پر جس طرح کہ جھوٹے دنیا ترک کرنے والے ترک کرنے کو کہتے ہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔ ہاں جس طرح کہ شارعؑ نے ترک دنیا کرنا بتایا ہے اس طرح پر ترک کرنا سچا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس طرح پر پکڑیں جس طرح کہ شارعؑ نے بتایا ہے نہ کہ اپنے جذبات نفسانی کی مرضی پر اور اس کو اس طرح پر کام میں لائیں جس طرح قانون قدرت نے ہم کو سکھایا ہے نہ کہ اپنی ہوائے نفسی کے مطابق۔ پس یہ بات سمجھنا کہ امورات دنیا میں مصروف ہونا عبادت نہیں ہے عین غلطی ہے۔ اس کو قانون قدرت کے برخلاف استعمال میں لانا شقاوت اور اس کے مطابق برتاؤ میں لانا عین عبادت ہے۔

سرسید نے اس خدا پرست کو نادان قرار دیا ہے جو صرف خدا کی محبت اور دنیا سے نفرت کا طلبگار ہو۔ جس کو زہد و تقویٰ کے سوا اور کچھ کام نہ ہو اور دنیا کی طرف سے نہایت عاجز و ذلیل اور بے استطاعت و بے مقدور ہو اور جو نہ خود عزت سے رہ سکے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے اور اس کے برعکس ایسے دنیادار کو بہت دانا سمجھتے ہیں جو نیک کاموں کے لئے دنیا اور اس کی نعمتوں کا طلب گار ہو اور دنیا کی جاہ و حشمت سے مالا مال ہو کر قوم کی بھلائی اور ترقی

کے اسباب مہیا کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ''طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی طرح غوٹرغوں غوٹرغوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے بلکہ اس نے جو چیزیں مرحمت کی ہیں ان کو اسی کے کام میں صرف کرنا خدا کی یاد ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو تمام نعمتیں اس لئے عطا کی ہیں کہ ہم خود بھی ان سے فائدہ اٹھائیں اور اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

جس زمانہ میں سرسید علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کرنے کی کوشس کر رہے تھے۔ دہلی کے نامور عالم اور مفسر قرآن مولانا عبدالحقؒ دہلوی نے مدرسہ کے مقاصد پر کچھ اعتراضات کر کے دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو ناپائیدار قرار دے کر یہ نصیحت کی کہ انسان ہر دم کو دم واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ سرسید نے مدرسہ کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور مولانا کی نصیحت کا یہ جواب دیا کہ بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے۔ مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر عمل رکھتے ہوتے تو آخر میں یہ ارقام نہ فرماتے ''سخن منتظر الجواب'' کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے۔ اس وقت آپ کو اپنی نصیحت کا کہ ہر دکو دم واپسیں جاننا چاہئے کیوں خیال نہ رہا؟ میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے؟ کبھی اپنے رہنے کے لئے چھپر ڈلوایا ہے؟ آپ کے پاس پہننے کے جوڑے ہیں؟ ان میں سے ایک تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے اور باقیوں کو آئندہ پہننے کے لئے رکھا ہوگا۔ کم سے کم نانبائی کو صبح و شام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے، اور اس ماہ مبارک رمضان میں سحری کے لئے بھی کچھ ضروری اٹھا رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی آسان ہیں مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں مگر ابیض نورانی* کا سب کو محتاج پایا۔ پھر بھلا آپ ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کے برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں؟ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے جس سے خدا اور رسولؐ نے منع فرمایا ہے اس سے ہم کو پرہیز کرنا چاہئے۔ اور جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لئے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعت محمدیہؐ کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو۔ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں اور اس نے ہمارے لئے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لئے وقف کر دی ہیں بھول نہ جائیں۔'' سرسید کے اس جواب سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا اور اس کی نعمتوں

* روپیہ۔

کو ناپائیدار قرار دے کر ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان میں اتنی ہمت' طاقت اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنی تباہ حال قوم کو زوال واد بار کی پستیوں سے نکال کر راہ ترقی پر گامزن کر سکیں اس لئے وہ دینداری کا سہارا لے کر ایسی باتیں کہتے ہیں جو دین کے خلاف ہوتی ہیں اور جس کا نتیجہ قوم کے حق میں مزید تباہیوں کی شکل میں نکلتا ہے۔

پاک اور ناپاک علوم

غلط اور گمراہ کن نظریات نے مسلمانوں میں جو نقصان رساں عقائد پیدا کر دیئے اور جن کو دور کئے بغیر معاشرہ کی حالت کو بہتر بنانا ممکن نہیں ہے۔ ان میں یہ غلط خیال بھی شامل ہے کہ صرف دینی علوم کی تحصیل تو عبادت میں داخل ہے لیکن دنیاوی علوم کو حاصل کرنا بے دینی اور گمراہی کا ثبوت ہے۔ علم دین فقہ' تفسیر اور حدیث تک محدود ہے اور جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کرتا ہے وہ خبیث بن جاتا ہے علم کے متعلق یہ نظریہ سرسید نے غلط قرار دے کر یہ واضح کیا کہ اسی سبب سے مسلمانوں میں روز بروز علم کا تنزل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے خود علم دین بھی معدوم ہوتا جاتا ہے۔ علوم دینیہ کا صرف جاننا نہ کچھ عبادت ہے اور نہ کچھ ثواب۔ البتہ وہ اس وقت عبادت یا ثواب ہو سکتا ہے جب کہ اس کو امور دینی کے کام میں لانے کی نیت سے پڑھا جائے۔ پس مدار عبادت وثواب نیت پر رہا نہ کہ نفس علم پر۔ اور یہی حال تمام باقی علوم کا ہے۔ وہ تمام علوم جن کو دنیوی کہتے ہیں ترقی واستحکام اور تعلی علوم دینی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ گو ان کا پڑھنا بھی فی نفسہٖ عبادت نہیں ہے مگر جب کہ علوم دنیوی اس نیت سے پڑھے جائیں یا پڑھائے جائیں کہ یہ علوم دینیہ کے لئے مثل آلہ کے ہیں تو ان کا پڑھنا یا پڑھانا بھی ویسا ہی عبادت ہے جیسا کہ علوم دینیہ کا ہے۔

علاوہ اس کے علوم دینوی بھی اگر ان کی تعلیم نیک طرح پر ہو تو باعث ترقی ایمان ہوتے ہیں۔ ہم ریاضی پڑھ کر خدا تعالیٰ کی اس قدرت کاملہ سے واقف ہیں جو خلق آسمان وزمین وکواکب وسیاروثوابت میں کام آتی ہے جس وقت ہم علم ارض پڑھتے ہیں تو ان عجائبات سے واقف ہوتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیوں کی رنگ آمیزی اور مکھی کی آنکھ کی پچی کاری ہم کو حکیم مطلق کی حکمت کاملہ پر یقین دلاتی ہے۔ اسی طرح تمام علوم ہماری معرفت کو قوت بخشتے اور خدائے واحد پر ہمارے ایمان کو اور مستحکم کرتے ہیں اور اس اعتبار سے اگر ہم ان علوم کو بھی علوم دینیہ میں شامل سمجھیں تو کچھ بعید نہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو ایسا عمدہ مذہب دیا ہے جو ہمارے معاد اور معاش دونوں کو قانون قدرت کے مطابق اصلاح کرنے اور ترقی دینے والا ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دنیوی کی تحصیل کریں تو دین کا کیا حال ہوگا۔ اسی طرح یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دینی پڑھا کریں تو ہماری دنیا کا' جس کی اصلاح شریعت سے خارج نہیں ہے' کیا حال ہو گا۔ علوم دنیاوی کے معدوم ہونے سے دین اور علوم دینی

دونوں کے معدوم ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی و کوشش کریں۔ اور ایک کو دوسریکا آلہ سمجھ کر دونوں کو پڑھنا اور پڑھانا داخل عبادت جانیں۔''

ثواب اور اس کا مقصد

مسلمانوں کا ایک اور عقیدہ جس کو سرسید معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے بدلنا چاہتے تھے۔ ثواب کا غلط تصور تھا۔ چند ایسے کام تھے جن کو کرنا مسلمانوں کے خیال میں کارثواب تھا اور مسلمان یہ سمجھ کر ثواب کے یہ کام انجام دیتے تھے کہ اس کے بدلے میں ان کو جنت ملے گی۔ سرسید کے نزدیک ثواب کا یہ تصور بہت محدود' غلط اور خودغرضی پر مبنی تھا۔ اور انہوں نے اس خیال کو بدلنے کی کوشش کی۔ عام طور سے ثواب کے جو غلط معنی لئے جاتے تھے ان کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ جب ہم پچھلے زمانے پر نظر کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ ہر طرف ہزاروں کھنڈرات' مسجدوں' پلوں' کنوؤں اور مہمان سراؤں کے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے مہمان سرائیں بنوائیں۔ کنوئیں کھدوائے اور پل بنوائے۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے مفرق تھے۔ سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجد کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بڑی بڑی عالیشان خانقاہیں بھی تعمیر کیں جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں لیکن مدرسوں کے کچھ زیادہ نشانات نہیں ملتے۔ تاہم کئی مدرسے بھی قائم کئے گئے۔ جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اور کئی مدارس اب بھی جاری ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے۔ لیکن جب زیادہ غور کرتے ہیں تو سب دھوکہ ہی دھوکہ نظر آتا ہے۔ جنہوں نے یہ کام کئے اور کر رہے ہیں۔ انکے دل سے پوچھو تو معلوم ہو گا کہ یہ سب کام اس خیالی جوش میں کئے ہیں کہ ہم ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھڑیاں باندھ رہے ہیں۔ مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جائیں گے اور بہشت میں ہم بڑے بڑے درجے پائیں گے۔ ہمارے سر پر تاج ہو گا اور ایک موتی کا محل جنت میں ملے گا۔ حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہو گا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہو گی۔ بے انتہا! جتنی چاہو! غلمان بھی نہایت خوبصورت ہوں گے۔ باغ ہو گا۔ میوہ ہو گا۔ نہریں ہوں گی۔ شراب ہو گی۔ پئیں گے اور چین کریں گے۔'' بہشت میں یہ عیش و عشرت حاصل کرنے کے لئے جو کام کئے جاتے ہیں سرسید نے ان کو قومی ہمدردی کے بجائے خودغرضی اور بالکل ایسے ہی کام قرار دیا ہے جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں انہی عیشوں کو حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ اگر باغبانوں کو مزدوری دے کر اپنے چین کے باغ لگوانا۔ مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے لئے محل بنوانا اور کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لئے شراب کھنچوانا قومی ہمدردی اور کارثواب نہیں ہے تو پھر وہ کام جو جنت میں عیش کرنے کی غرض سے کئے جاتے ہیں

قومی ہمدردی اور ثواب کے کام کیسے ہو سکتے ہیں۔

ثواب کے کاموں کو مسجدوں' خانقاہوں اور تالابوں کی تعمیر تک محدود رکھنے اور جنت میں عیش کرنے کی غرض سے یہ کام کرنے کے رجحان کو بدل کر قومی فلاح و ترقی کے لئے تمام ضروری کام انجام دینے پر لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے سرسید نے یہ بتلایا کہ اسلام کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی مگر فتح مکہ کے بعد اسکا اجر کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تجہیز کے لئے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیقؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہی سچا اصول مذہب اسلام کا ہے۔

ثواب کے کام

مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو خدمت خلق کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھتے تھے اور نیک کام کرنے کی امکانی کوشش اپنے نقطہ نظر کے مطابق کرتے تھے لیکن ان لوگوں کا نیکی اور خیر کا تصور چونکہ بہت محدود تھا اس لئے وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری امور اور خدمت خلق کے زیادہ اہم اور ضروری پہلوؤں پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ثواب کے کام بس اسی حد تک محدود تھے کہ مسجدیں بنوا دیں' لوگوں کے آرام کے لئے کنویں کھدوا دیں اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال نے مسلمانوں کو جن مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے بگڑے ہوئے حالات نے معاشری اصلاح' اقتصادی بہتری اور قومی ترقی کے لئے جن مسائل کو حل کرنا ناگزیر بنا دیا تھا ان پر قابو پانے کی تدبیریں ان کی نظر میں نہ تو نیکی اور ثواب تھیں اور نہ خدمت خلق۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس حقیقت کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کی معاشری زندگی کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے وجود کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس زمانے میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا ثواب کا کام قوم کی خدمت کرنا اور اس کو تباہی و بربادی سے بچانے میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے دل میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے۔ اور ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوتی ہے۔ انسانوں میں نیک وہ ہے جو بہت سی نیکیاں کرے مگر سب سے زیادہ نیک وہ ہوگا جس کی نیکیاں سب سے زیادہ افضل اور اعلیٰ ہوں۔ بعض لوگوں نے پل۔ مسجدیں۔ اور کنویں بنوائے اور ان چندروزہ رہنے والی نیکیوں کو خیر دائم سمجھ لیا۔ بعض لوگوں نے خیر خیرات میں زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا لیکن ان کی یہ نیکیاں خیر دائم نہیں بلکہ چندروزہ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو بجز رفاہ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ تو نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے

کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہو جاتی ہے بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے اور قیام دنیا تک دائم رہتی ہے۔ اس لئے صرف یہی ایک نیکی ہے جس کو خیر دائم کہہ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء کو عطا کی۔ پس انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے اور تمام نیکیوں میں سے افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا ہے پس فلاح عام کے کاموں کو عبادات دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور تسبیح وتہلیل کو عبادت جاننا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خیر دائم اور بھی زیادہ نیک اس وقت ہو جاتی ہے جب اسکی ضرورت ہو اور موجودہ زمانے میں اور بالتخصیص مسلمانوں کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صرف تسبیح وتہلیل اور زہد وتقویٰ ہی پر تکیہ نہ کریں اور صرف ادائے زکوٰۃ اور قضائے دلدین ہی پر اقتصاء نہ کریں بلکہ تھوڑا سا وقت اور دو چار درہم رفاہ وفلاح حال مسلمانان کے لئے بھی نکالیں اور خیر دائم کی نیکی کو بھی حاصل کریں۔

سرسید کو اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان اس کار خیر کو محض ایک دنیاوی معاملہ سمجھتے تھے۔ اور اس کو اپنا دینی فرض اور افضل و اعلیٰ نیکی خیال نہ کرتے تھے۔ سرسید کو اپنی مشکلات کا احساس تھا اور وہ ان کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرستہ العلوم کی امداد کے سلسلے میں مولوی محمد علی حسن خاں کو لکھا تھا کہ ایک عام خیال نسبت حسنات و خیرات ومبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں۔

تقلید پرستی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے لئے ہے اور ہر ملک اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جو مذہب اس قدر ہمہ گیر، آفاقی اور دائمی ہو اس کو مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں نئے نئے مسائل حل کرنا ہوں گے۔ اور زمانے کے تقاضوں کو دینی اصول ومقاصد سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ ورنہ انسانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گی اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والا مذہب محض بے جان عقائد کا مجموعہ بن کر غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اسلام نے انسانی معاشرہ کی اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کو اجتہاد کرنے کا اختیار دیا ہے تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمانے کے نئے نئے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور اسلامی معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ لیکن جب مسلمان زوال پذیر ہو گئے تو انہوں نے اجتہاد کو ترک کر کے محض تقلید کا طریقہ اختیار کر لیا اور یہ فرض کرنے لگے

کہ اجتہاد کی آزادی تو اماموں پر ختم ہوگئی ان کے بعد اجتہاد کی مطلق گنجائش نہیں اور اب مسلمانوں کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی امام کی تقلید کریں۔ تقلید کے اس غلط تصور نے اسلامی معاشرہ کی ترقی کو روک دیا اور وہ زوال پذیر ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت انتہائی پست ہوگئی اور مسلمانان عالم سے بہت دور ہوگئے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں میں تقلید کا یہ رجحان ان کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ اور ان کے زوال و ادبار کا ذمہ دار تھا۔ وہ اماموں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اور ہمیشہ اسی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند کر کے محض تقلید کرتے رہنے سے مسلمانوں اور اسلام کو بہت نقصان پہنچا ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان تقلید کے بارے میں اپنا نظریہ بدل دیں۔ چنانچہ محسن الملک کے نام ایک خط میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے صحیح حاصل ہوتی ہے تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کرسکیں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ائمہ کبار درکنار و مولوی حبو کی بھی تقلید کافی ہے۔ کیونکہ لا الہٰ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں دشمن اسلام ہوں یا مثلِ ابوبکرؓ و عمرؓ کے دوست اسلام ہوں میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباب من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے۔''

سرسید اسلام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی کے لئے اجتہاد کو لازمی خیال کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ متاخرین اہل سنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ بنایا ہے کہ اجتہاد ختم ہوگیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا۔ اکثر علمائے دین کا یہ مذہب ہے کہ ہر زمانے میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی اہل سنت و الجماعت کی ہے کہ اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مانتے ہیں۔ اسی غلط اعتقاد نے مسلمانوں کو دین و دنیا میں نہایت نقصان پہنچایا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس خیال کو چھوڑ دیں اور ہر بات کی تحقیق پر مستعد ہوں خواہ وہ بات دین کی ہو یا دنیا کی۔ غور کرنا چاہئے کہ ہر گاہ زمانہ حادث ہے اور نئے نئے امور اور نئی نئی حاجتیں ہم کو پیش آتی ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد موجود نہ ہوں گے تو ہم مردہ مجتہدوں سے نئی بات کا مسئلہ جو ان کے زمانے میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی کیوں کر پوچھیں گے۔ پس ہمارے لئے بھی مجتہد العصر و الزمان ہونا ضروری ہے۔'' جو لوگ ائمہ کبار کے اجتہاد کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور

ہر حال اور ہر زمانے میں ان کی تقلید کرنے کے قائل ہیں وہ لوگ سرسید کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کا یہ غلط عقیدہ ائمہ کو وہ مرتبہ دینا چاہتا ہے جو صرف رسول کے لئے ہے۔ کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ جس طرح خدا کو اپنی ذات و صفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اس کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔''

سرسید نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو دینی گمراہی سے بچانے اور اصلاح و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے ان کے عقائد درست کرنے کی جو کوششیں کیں وہ مسلمانوں میں ایک فکری و ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی بنیاد بن گئیں۔ اور جدید دینی افکار کی تشکیل میں سرسید کے نظریات نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔

(بہ شکریہ ثقافت لاہور)

☆☆☆

طلوع اسلام (حاشیہ)

سرسیدؒ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے اصول فطرت (نیچر) کے عین مطابق ہیں۔ اس وجہ سے مخالفین انہیں نیچری کہہ کر پکارتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کی نگہ ژرف بیں نے دیکھ لیا تھا کہ اقوام مغرب' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے باقی دنیا کو بالعموم اور مسلمانوں کی دنیا کو بالخصوص اپنے تابع فرمان بنائے جا رہی ہیں اور مسلمانوں کو صدیوں سے یہ غلط سبق دیا جا رہا ہے کہ دنیا قابل نفرت ہے اور اس کے ترک کر دینے میں ہی انسان کی نجات ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس ذلت آفریں تعلیم کے شکنجہ سے نکال کر تسخیر فطرت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے فطرت پر اس قدر زور دیتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی کبھی ''انسانی فطرت'' کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں جیسا کہ طلوع اسلام میں متعدد بار اس حقیقت کو پیش کیا جا چکا ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ اس میں کچھ صلاحیتیں ہیں جن کی نشوونما کر کے ان سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا اسلام ہے۔ (تفصیل ان امور کی سلیم کے نام خطوط میں ملے گی) لہٰذا سرسیدؒ کے ہاں جہاں فطرت کا لفظ آئے وہاں اس سے مراد قوانین فطرت یا فطرت کی قوتیں لی جانی چاہئے۔ اسے انسانی فطرت پر محمول نہیں کرنا چاہئے۔

☆☆☆

JUSTICE OR JUST ICE! IV

By

Aboo B. Rana

****

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

Meaning of the above verse is: the unfortunate droplet that could not belong in the cradle of its shell, is alienated; it can never achieve its destiny, to transform itself into a pearl. For the natural process to take shape, all things have to be in the right place at the right time.

What we are experiencing nowadays, are only partial pleasures, from the fruits of individual labours of the few great natural men in this world. What treasures lie hidden, if the whole of mankind involved itself, in searching for the Natural Order, our minds cannot fathom. Our haphazard living and limited knowledge will not allow us, to soar to heights, where we can transcend ourselves to become *aware of Life*. Our perceptions have been paralyzed by stagnant rituals of decomposed thoughts. We have become too immune to the pleasures, in the distorted world that we have made for ourselves, which is why we cannot visualize the real joy of life. Though I cannot say, after reading the Quran that it is impossible, it certainly is very exasperating even to think of the long road we shall have to travel, in order to find our way out of this mechanic jungle, back to natural living. May the Heavens help us!

We can only know the reality of this universe, inasmuch as it will allow us within human dimensions. Otherwise, as far as speculations are concerned, sky is the limit. In the previous discussion, I proposed that according to my understanding of the little knowledge which I possess, Adam could not live up to the standards of the Heaven of God. Hence, humankind was transferred to a lower level of existence, but not expelled, for its mistake, of going near the forbidden tree. The Arabic word Quran has used, in the story of Adam and his spouse, is *ha'bouth*, which means decline in English language. Or the meaning, to be demoted, also seems fitting in this episode. Quran has used the term, 'Adam' to represent humankind. Let me bring to your attention the fact, in the whole literature of the Quran, there is no

mention of the word 'Eve.' The story of Adam and Eve is Biblical. The Quran tells us the story, in words such as, 'Adam and his spouse.'

As far as Adam being a personality is concerned, according to the research of Parwez[R], it is only mentioned once in the Quran. In the chapter of Al Imran verse 33. Even in this one time mention of Adam, as a personality, Quran does not state Adam as a messenger of God. For a messenger or representative of God, to make a mistake of such a colossal magnitude that he has been demoted to a lower level of existence, would be contrary to the teachings of the Quran. As time and again, Quran relates the following words of God, *and Satan will have no influence with his diabolical temptations, on My people.* For example in chapter 15; verse 42 and chapter17; verse 65, addressing Satan, Allah almighty in the Quran states:

> "And upon my devoted men, you will have no influence; except those who have strayed from their correct path and listen to you."

If Adam did make a blunder, in the Garden of Heaven, as we learn from the Quran, in that case he cannot then be called a messenger of Allah. There is another factor that becomes a source of confusion, arising in our belief of Adam as a messenger of Allah. Messengers are meant to guide the strayed human community in a certain direction. For that purpose these messengers bring for us, the word of God. If Adam, as is commonly believed, is the first messenger and human that Allah created, the question arises as to who was he supposed to guide. And to whom was he addressing the word of God, being a messenger. As angels they do not need guidance, as far as I know, from human beings. For the angels:

There is not to reason why,

There is but to do and die!

And messengers never disobey the Almighty, or fall for the temptations of Satan! We know that from the Quran, in the verse that has just been quoted above. From whichever perspective we may think on this story of Adam, which the Quran narrates, we only come to one conclusion. The word Adam, in the Quran, means humankind. This episode is none other than an allegorical narration of humankind.

If we observe minutely, even the modern scientific thought is moving in the direction of the Quran though it has not yet achieved complete harmony with it. Erich Fromm, in his very interesting book, *The Sane Society*, which is a combination of socio-analysis and psychoanalysis, says:

"The problem, then, which the human race as well as each individual has to solve, is that of being born. Physical birth, if we think of the individual,

is by no means as decisive and singular an act as it appears to be. It is, indeed, an important change…….but in many respects the infant after birth is not different from the infant before birth; it cannot perceive things outside, cannot feed itself; it is completely dependent on the mother, and would perish without her help. Actually the process of birth continues. The child begins to recognize outside objects, to react affectively, to grasp things and to co-ordinate his movements, to walk. But birth continues. The child learns to speak, it learns to know the use and function of things, it learns to relate itself to others, to avoid punishment and gain praise and liking. Slowly, the growing person learns to love, to develop reason, to look at the world objectively…….The whole life of the individual is nothing but the process of giving birth to himself.

> "From all we know about the evolution of the human race, the birth of man is to be understood in the same sense as the birth of the individual……..and human history is nothing but the whole process of this birth."

Actually, the purpose of this allegory of Adam, that Quran proffers, is manifold. In spite of having severed his ties with Nature, humankind can still remove the conflict between human nature and its social rituals. This cutting of the umbilical cord, which related Adam with natural order, is also symbolical of the birth of man's independence. This independence can only progress, in those who admit their mistakes. Satan refuses, as we observe in this episode, to bow before Adam; even though he is being commanded by God. Furthermore, Satan puts the blame of his errors on God. In the dialogues between God and Satan, famous visionary of our age Sir M. Iqbal, has come up with a very acute argument that is worth recalling. In the poem the argument put forth by Satan is:

> "How can I dare, in this Universe that belongs to You, to disobey Your orders?"

And God counter enquires from Satan, "And when did this thought dawn upon you? Was it before or was it after disobeying My orders?"

> "It dawned afterwards, O Lord of Miracles!" replies Satan hopelessly.

Before his disobedience, Satan is admitting, he did not realize God was the supreme power. Perhaps, for this acceptance of God's Omnipotence, even though it came after the damage was done, Satan is allowed freedom till the Day of Judgment.

I cannot, rival in depth the beauty in words, of the original poem of Iqbal; nevertheless, I hope I have conveyed the true meanings. In other

words, from this allegory, we also learn that Godly system gives a chance even to Satan to repair a mistake. The principle of Justice is not only limited to human species, in natural jurisprudence. There is always present, in Nature, the element of hope. That one must never underestimate the abundance and affluence of Almighty provided man is being honest in matters that concern him. Surely, the Quran warns us, that Satan is on the loose and shall allure humankind from every possible way. At the same time, the Book also sympathizes and lends hope, to those who want to know the correct path. It is for this purpose, the Quran propounds a social order for humankind to adopt, in order to bring humankind in harmony with nature. Otherwise as Iqbal says:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

In fact, it appears as though, even the word Satan in Quran has been used many a times symbolically. In this connection, there is a *hadith* that Messenger Mohammad (PBUH) once mentioned that each one of us has our own Satan. One of the disciples inquired that if his Highness was also in possession of a Satan. “Yes! And I have converted him into a Muslim,” was the Messenger’s reply. Of course, with the passage of time, as our minds shall develop and refine, with the advancement and research in the sciences, we will be able to discover more profound meanings in these episodes of Quran.

The justice of the Quran is not a partial one. Its quintessential message to humankind, if we want to be in unison with nature, is to grasp and apply justice in its totality. From this viewpoint, Quranic education, as I mentioned before, is not only *information* of our past history. Actually it puts every person in the Quranic social order *in formation*. In order to be in formation, we must know ourselves. In the same manner as the founders of Pakistan were in formation. Sir Syed Ahmed watered the dying plant of Islam in the Indo-Pakistan sub-continent; Sir Muhammad Iqbal purified the grounds, by removing the pebbles and stones of parasitic ideas within and pruned it with the beauty of his words; Qaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah applied the ideas of the former two and materialized them, in the form of a separate homeland. And last but not the least was Allama Parwez, who devoted all his life to nourish and expose the real plant of Islam to the general public and the world at large. As Sir Muhammad Iqbal rightly points that in Islam people are not counted, they are weighed. As mentioned before, none of these giants of men used any kind of underhand political tactics, threats or arms to achieve

their goals. Even their thoughts were simple and straight forward. An example of Jinnah's simplicity of thought coincidently came to my mind, while I am writing, which my late father Mr. F. Rahman Deen, an ardent and active member of Tolu-e-Islam, once narrated to me. Jinnah was invited over for a meeting with a Raja of India, Rai Bahadur Sundardas, at his bungalow. My father Mr. Deen who was also invited, was in close quarters and overheard, when the Nawab inquired from Jinnah as to why was he demanding a separate piece of land. Jinnah in his sophisticated manner of leadership, instead of advocating the deep ideology or philosophy of Islam, cut through into the heart of the matter and going straight to the point, replied the Raja very calmly,

> "Look Mr. Sundardas, a Hindu will not accept a glass of water from my hands, how can we live together!"

Jinnah knew what he was talking about. How just was his demand and how justly was his manner. His passions for a separate land were not without compassion. In this quest for freedom, he had to sacrifice everything; he had no time even for his own family what to talk about friends. His sister Fatima was the one who volunteered to remain close with him, till his last day. As days went into years, we experienced the hair-splitting insight of Jinnah. His words spoken to the Raja in years gone by, gave a practical demonstration, in the form of Muslim-Hindu skirmishes in India in our recent years and which have not come to any conclusion even till today. My ears, from an impressionable age, are listening to talks of guns, womanizing and false propaganda, from the ignorant masses that stigmatize and blemish the character of these great personalities, ever since I left school. As a peace loving individual, I have only to say,

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

I was relating the significance of discipline, being *in formation* or team work that is needed, to do justice and give shape to any community's life. Otherwise it shall be an unlived life. In order to live we must be able to feel and sense the winds of nature and be one with it. It is not quantity that matters, it is the quality. Without the teamwork of leaders, we can gather together people or call them a lonely crowd, but they cannot be called a lively nation.

****

iNTELLI Soft Technologies

Deliver Net Results

Our business Development Centers are home to team of high performance Consultants, developers and designers who leverage their extensive experience.

We Provide the Following Services:

Software Development

iNTELLI Soft Technologies can build any application that you require. As per your requirements, we will spec it, build it, implement it and train your people on how to use it. Our software development services provide a fully integrated environment by dramatically increasing system efficiency and simplifying user operation.

Web Development

iNTELLI Soft Technologies designs and implements e-business solutions for companies trying to enter the competitive e-business market. We can help you to be on the edge of innovation so that you are always ahead of your competitors.

Networking

Our networking services are centered around our experience with subnated and managed, Ethernet based LANs. Implementation of variety of networking solutions including internet/Intranet, Messaging & Exchange servers.

Online Examination/Survey System

Web based online examination system with administrative interface and real time results which can be exported to Excel format. Especially designs for educational institutions with complete user security.

Cable Internet

1) Planning & Designing
2) Installation
3) Enhancement and up gradation
4) Complete automated user Management system.

Contact us:

Website	**www.intellsofttech.com**
E-mail	**info@intellsofttech.com**
Phone	**0333-4289997**
	0300-9426443
	0300-5137633